خوف و تجسس سے بھرپور ایک حیرت انگیز ناول

ظلمت کدہ

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

مضبوط دل والوں کے لیے سسپنس، تجسس اور خوف سے بھرپور ایک خوفناک کہانی

ظلمت کدہ

تحریر: ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

(یہ تحریر ڈائجسٹ میں ایم۔ اے عظیم کے نام سے چھپی تھی)

پبلشرز : ادارہ کتاب گھر

کمپوزنگ : حرف کمپوزرز، 36/D، لوئر مال، سیکریٹیریٹ بس سٹاپ، لاہور

0300-4054540;http://www.urduhost.com/haf

کتابی شکل میں ملنے کا پتہ : http://www.urducorner.com

kitaab_ghar@yahoo.com

پیش لفظ

انسانی زندگی عجیب و غریب واقعات کا دوسرا نام ہے لیکن کچھ واقعات غیر معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں، جن کی یاد ہمیشہ کے لیے دل و دماغ میں پیوست ہو کر رہ جاتی ہے۔ زیرِ نظر کہانی "ظلمت کدہ" ایک ایسے انسان کی سچی داستان ہے جو اپنے اوپر گزرنے والے واقعات کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ ایک ایسے چور کی کہانی جو پولیس سے بچنے کے چکر میں ایک پراسرار مکان کے بھوتوں اور چڑیلوں کے شکنجے میں جا پھنسا۔ سسپنس، تجسس اور خوف سے بھرپور ایک ایسی خوفناک کہانی جسے صرف مضبوط دل والے ہی پڑھ سکتے ہیں۔

"ظلمت کدہ" بطورِ خاص "کتاب گھر" کے اُن قارئین کے لئے پیش کی جا رہی ہے جنہیں پراسراریت اور خوفناک کہانیوں سے لگاؤ ہے۔ یہ کہانی اپنے پڑھنے والوں کو نہ صرف بھوتوں اور بدروحوں کی ماورائی دنیا کی سیر کراتی ہے بلکہ قیامِ پاکستان سے قبل کے اُس تاریخی دور میں بھی لے جاتی ہے جہاں آپ اُس وقت کے مسلمانوں کے رہن سہن کے علاوہ "برٹش راج" کے بارے میں عوامی تاثرات اور 'جدوجہدِ آزادی' کے سیاسی حالات سے بھی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔

امید ہے یہ کتاب بھی آپکو پسند آئے گی۔ ہمیں اپنی آراء سے نوازتے رہیں تاکہ ہم بہتر انداز میں اُردو زبان، اور اُردو بولنے والوں کی خدمت کر سکیں۔

حسن علی خان

ادارہ کتاب گھر



ڈاکٹر امان پچھلے ایک سال سے، حیدر آباد کے مشہور و معروف، ذہنی امراض کے ہسپتال، گدو بندر میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھا۔ وہ میرے آ جانے سے بے حد خوش تھا۔ ہم دیر تک گزرے ہوئے حسین دنوں کی یاد تازہ کرتے رہے۔ ایک دوسرے کو اپنی مصروفیات بتائیں اپنے اپنے حالات سنائے۔ پھر امان نے مجھے پاگل خانے کی سیر کرائی۔ مختلف شعبے دکھائے۔ خاص خاص مریضوں کے بارے میں بتایا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ نہایت دلچسپ اور عجیب دنیا تھی یہاں کی ایک سے ایک عجوبہ روزگار انسان یہاں موجود تھا۔ ان کی حرکتیں اتنی عجیب و غریب تھیں کہ دیکھ کر ہنسی بھی آتی تھی اور دکھ بھی ہوتا تھا۔ کئی بار میں کوشش کے باوجود خود کو روک نہ سکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے کسی دوسرے کی دلچسپ حرکت دیکھ کر میری بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی۔ ان پاگلوں میں کوئی بادشاہ بنا ہوا تھا تو کوئی وزیر اعظم، کوئی منسٹر بنا ہوا تھا تو کوئی فقیر، لیکن کئی ایسے بھی نظر آئے جو بالکل ہوش مند انسانوں کی طرح باتیں کر رہے تھے اور کسی طرح بھی پاگل نہیں لگتے تھے لیکن بہرحال پاگل تھے۔ غرض عجب تماشہ تھا۔ اگر ان سب کا حال لکھنے بیٹھوں تو پوری کتاب بن سکتی ہے۔ لیکن یہاں میں آپ کو ایک خاص واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ جو یہاں کے مریض نے مجھے سنایا تھا۔

واپس اپنے کمرے میں آ کر ڈاکٹر امان نے مجھے بتایا کہ یہاں جتنے بھی مریض ہیں، ہر ایک کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی واقعہ، یا حادثہ ایسا ہے جس نے انہیں اس حال کو پہنچایا ہے اگر تم کہو تو میں تمہیں ایک ایسی کہانی سنواتا ہوں جسے سن کر تم حیرت زدہ رہ جاؤ گے۔ گو اس کہانی پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن جس مریض نے یہ کہانی بلکہ آپ بیتی مجھے سنائی ہے اس کے بارے میں، میں مکمل تحقیقات کر چکا ہوں اور یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس واقعہ کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔

میں خود بھی کسی سچی کہانی کی تلاش میں تھا۔ لہذا میں نے فوراً اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔

ڈاکٹر امان نے مزید بتایا کہ اس مریض کے بارے میں ہسپتال کے ڈاکٹروں اور ملازمین کا کہنا ہے کہ اسے تین سال قبل زنجیروں میں باندھ کر یہاں لایا گیا تھا۔ اس وقت اس کی ماں بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کی ماں کا کہنا تھا کہ یہ عورتوں کا اچانک دشمن بن گیا ہے اور جب یہ کسی بھی عورت کو دیکھتا ہے تو بدروح اور چڑیل کہہ کر اس پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس کی ماں نے بتایا تھا کہ یہ کئی بار مجھ پر بھی حملہ کر کے مجھے زخمی کر چکا ہے۔

لیکن جب اس کی ماں سے پوچھا گیا کہ اس کی یہ حالت کیسے بنی۔ تو وہ بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ صرف اتنا بتایا کہ اس کا نام رشید ہے۔ یہ بچپن سے ہی بری صحبت میں پڑ کر آوارہ بن چکا تھا۔ راتوں کو بہت دیر سے گھر آیا کرتا تھا۔ ایک رات بہت دیر سے گھر آیا تو اس کی حالت دیکھ کر میں ڈر گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ اس کا تمام جسم اور کپڑے پسینے میں تر تھے، وہ حد سے زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی دروازے کی طرف اشارہ کر کے صرف اتنا کہا "ماں، مجھے، اس سے بچالو" پھر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

میں بہت گھبرا گئی کہ یہ اتنا خوف زدہ کیوں ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی آدمی اس کی جان کا دشمن بن گیا ہے۔ میں دروازے تک آئی اور باہر گلی میں جھانک کر دیکھا، مگر وہاں کوئی نہ تھا اور گلی سنسان پڑی تھی۔

میں نے واپس آ کر اسے اٹھانا چاہا تو چونک پڑی۔ اس کا پورا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ میں نے پڑوسیوں کی مدد سے اسے اسپتال پہنچایا۔ جہاں اسے تیسرے دن ہوش آیا مگر بے ہوشی میں بھی یہ یہی بڑبڑاتا رہا کہ میرے قریب نہ آنا... میں تمہیں... مار ڈالوں گا... مجھے بچاؤ... بچاؤ... پھر یہ ایک مہینہ اسپتال میں رہا اور بظاہر ٹھیک ہو گیا۔ ہم لوگ اسپتال سے گھر آ گئے۔ کئی دن بعد ایک رات اس پر پھر دورہ پڑا، اس رات سے اس

کی یہی حالت ہے۔ اکثر ڈرا سہا رہتا ہے۔ لیکن کسی عورت کو دیکھتے ہی اس پر حملہ کر دیتا ہے۔

اس کی ماں رو رو کر ڈاکٹر سے کہنے لگی کہ ڈاکٹر صاحب! خدا کے واسطے اس کا علاج کیجئے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کی سوا دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے اس عورت کو تسلی دے کر واپس بھیج دیا۔ پھر رشید کا علاج ہوتا رہا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں۔ اس پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ اب جلد ہی اسے یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔ اتنا بتا کر ڈاکٹر امان تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر امان پھر کہنے لگے، بعد میں، میں نے رشید سے پوچھا تھا کہ وہ کیسے اس حالت کو پہنچا۔ اس کے جواب میں رشید نے جو کچھ بتایا وہ اتنا حیرت انگیز اور عجیب تھا کہ مجھے یقین نہ آیا۔

ڈاکٹر امان تو یہ سب بتا کر خاموش ہو گیا لیکن میرے دل میں اشتیاق جاگ اٹھا تھا۔ لہذا میں نے بے چینی سے پوچھا

"یار امان! تم چپ کیوں ہو گئے۔ مجھے بتاؤ نا۔ رشید نے تمھیں کون سی کہانی سنائی تھی" میری بات سن کر امان مسکرانے لگا۔ پھر بولا

"اب تمہارا تجسس جاگ اٹھا نا۔ خیر ایک منٹ رکو۔ میں ابھی رشید کو بلاتا ہوں۔ یہ کہانی اسی کے منہ سے تمھیں مزا دے گی" یہ کہہ کر امان نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ فوراً ایک ملازم حاضر ہوا۔ امان نے اس سے کہا "غفور! جا کر رشید کو بلاؤ"

چار منٹ بعد اندازاً پچیس سالہ قبول صورت شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا جسم درمیانہ اور قد اندازاً ساڑھے پانچ فٹ تھا اس کی رنگت گندمی اور آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ اس نے ادب سے ہم دونوں کو سلام کیا اور دونوں ہاتھ ملا کر کھڑا ہو گیا۔ امان نے کہا

"بھئی رشید تم کھڑے کیوں ہو۔ آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤ اور دیکھو! یہ میرے بہت ہی پیارے دوست سلیم صاحب ہیں" امان نے میری طرف اشارہ کر کے کہا " یہ بہت دور سے تمہاری کہانی سننے آئے ہیں۔ انھیں اپنی کہانی سناؤ۔ یہ تمہاری کہانی کو اخبار میں شائع کریں گے"

رشید شکریہ ادا کر کے میرے قریب رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"سلیم صاحب! میری کہانی اتنی عجیب، پراسرار اور حیرت ناک ہے کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی تو مجھے خود ہی یقین نہیں آتا اور یوں لگتا ہے جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا لیکن بہر حال وہ ایک خواب نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت ہے اور میرے پاس اس کا ثبوت بھی موجود ہے۔ اگر آپ کہیں گے تو میں ثبوت بھی آپ کو دکھا دوں گا۔ کیونکہ میں جلد یہاں سے جانے والا ہوں۔ ویسے بھی اس واقع سے پہلے میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا بس بعد میں خوف نے میرا دماغ الٹ دیا تھا۔ لیکن خدا کی مہربانی سے اب میں بالکل ٹھیک ہوں"

امان نے چائے منگائی تھی، رشید نے چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی آپ بیتی شروع کی۔

میں غور سے رشید کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا اور اس کی کہانی سن رہا تھا در حقیقت میں اس کے چہرے سے اور کہانی سے جھوٹ پکڑنا چاہتا تھا۔ مگر مجھے اعتراف ہے کہ اس کے چہرے پر اور الفاظ میں بالکل سچ ہی سچ دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے یہ محسوس ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ کبھی پاگل رہا ہوگا۔ وہ تو مجھے بھلے انسانوں سے زیادہ عقل مند اور ہوشیار لگتا تھا۔ وہ بولا "سلیم صاحب بعض۔ اوقات انسان کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو عقل و خرد سے ماورا ہوتے ہیں اور جنھیں انسانی ذہن سمجھ ہی نہیں سکتا لیکن آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اسے جھٹلانا بھی ناممکن ہوتا ہے" اس نے کہنا شروع کیا۔

"میرا نام رشید احمد ہے اور میرے والد کا نام سعید احمد تھا۔ ہر ماں باپ کی طرح میرے والدین کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں۔ ہم لوگ لاہور کے رہنے والے ہیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ یہی وجہ تھی ماں باپ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ میرے والد شہر کے ایک رئیس حاجی لال بخش کے ہاں ملازم تھے۔ گو ہم لوگ غریب تھے لیکن پھر بھی دال روٹی آسانی سے مل جاتی تھی۔ جب میری عمر چھ سات سال ہوئی تو والد صاحب نے مجھے مقامی اسکول میں داخل کرا دیا، حالانکہ میں بہت ہوشیار تھا مگر پڑھنے لکھنے میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ اس کے برعکس میں گھومنا پھرنا یا اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ میرے والدین مجھ سے نہ جانے کیا کیا امیدیں وابستہ کیے

ہوئے تھے، مگر قدرت میرے لیے کسی اور ہی راستے کا انتخاب کر چکی تھی۔

حد سے زیادہ لاڈ پیار نے آہستہ آہستہ مجھے بگاڑنا شروع کر دیا تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح میں چار جماعتیں پاس کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن ابھی پانچویں جماعت میں داخل ہوئے مجھے چند روز ہی گزرے تھے کہ ہماری بدقسمتی کا سیاہ دور شروع ہو گیا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک روز ہمارے رئیس حاجی لال بخش کے مجھلے بیٹے امیر بخش کی سالگرہ کی خوشی میں دعوت ہوئی، میرے والد صاحب رات گئے۔ دعوت سے لوٹے لیکن گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ان کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگا اور آدھی رات تک ان کی حالت تشویشناک ہو گئی۔ ابھی ہم کسی ڈاکٹر صاحب کو بلانے کے لیے جا ہی رہے تھے کہ انہوں نے دم توڑ دیا۔

ہمارے گھر میں کہرام مچ گیا، لیکن وہ رات صرف ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ پورے شہر کے لیے قیامت کی رات تھی۔ اس ایک رات میں شہر کے نو آدمی ہلاک ہوئے تھے اور وہ سب کے سب اس دعوت میں شریک تھے۔ ان نو مرنے والوں میں رئیس کا ایک بھتیجا، گیارہ سالہ افتخار بھی شامل تھا۔

پولیس نے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ آٹھ دیگوں میں سے ایک دیگ کا کھانا زہریلا تھا۔ اس دیگ میں سے جتنے لوگوں نے بھی کھانا کھایا تھا وہ سب بیمار پڑ گئے تھے۔ جب باریک بینی سے جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ کسی طرح اس دیگ میں ایک چھپکلی گر گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے دن رات ایک کر کے باقی لوگوں کو مرنے سے بچا لیا تھا۔

والد صاحب کے اچانک انتقال کے بعد ہماری دنیا اندھیر ہو چکی تھی، خاص طور پر والدہ پر جیسے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ میرے والد اور والدہ میں بڑی محبت تھی۔

یہ غنیمت تھا کہ وہ مشین چلانا جانتی تھیں۔ لہٰذا اس طرح گزر بسر ہوتی رہی۔ لیکن میرے سر پر جب والد کا سایہ نہ رہا تو میں جیسے آزاد ہو گیا۔ انہی دنوں میں آوارہ لڑکوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ میری والدہ نے مجھے سنبھالنے کی بے حد کوشش کی لیکن میں دن بدن بگڑتا چلا گیا۔

پانچویں جماعت بمشکل پاس کرنے کے بعد میں نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اب میں چوری بھی کرنے لگا تھا۔ جب میری عمر بیس سال کی ہوئی تو میں مکمل چور بن چکا تھا۔ دن بھر آوارہ گردی کرنا اور راتوں کو دیر سے گھر آنا میرا معمول بن چکا تھا۔ میرے دو تین ساتھی اور بھی تھے، ہم ایک ساتھ چوری بھی کرتے تھے۔ ایک بار جب میرے دو ساتھی پکڑے گئے تو اس کے بعد میں نے اکیلے ہی کام شروع کر دیا۔ اب میرا کوئی ساتھی نہ تھا۔ میں اکیلا ہی اپنا شکار تلاش کرتا اور نہایت ہوشیاری سے شکار کر کے واپس آ جاتا۔ میں نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے اپنا کام کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ میں ایک بار بھی پولیس کی گرفت میں نہیں آ سکا تھا۔ گو اب میں مکمل طور پر برا آدمی بن چکا تھا، لیکن پھر بھی چند ایک باتیں مجھ میں ایسی تھیں جن کو آپ اچھی باتیں کہہ سکتے ہیں۔ ان میں ایک بات تو یہ تھی کہ میں چونکہ خود غربی میں ہی پلا بڑھا تھا اس لیے غریبوں کے ہاں میں کبھی چوری نہیں کرتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اپنی ماں، بہن سمجھتا تھا۔

میں ہمیشہ امیر اور دولت مند لوگوں کو ہی اپنا نشانہ بناتا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ غریب بے چارے تو اپنا پیٹ ہی مشکل سے پالتے تھے۔ اس لیے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اگر جاتا بھی تو مجھے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا، جبکہ امیر لوگوں کے پاس بہت کچھ ہوتا تھا مجھے میری محنت کا صلہ اچھا خاصا مل جاتا تھا۔ ایک اور بات یہ تھی کہ بچپن سے مجھ میں تجسس کا مادہ بہت زیادہ تھا"

یہاں تک پہنچ کر رشید، چند لمحات کے لیے رکا، اس نے سگریٹ سلگایا۔ دو چار لمبے لمبے کش لیے اور پھر کہنے لگا۔

"اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ ایک بار میں ایک امیر آدمی کے گھر کوٹا کا، اس کی شاندار کوٹھی، شہر کے آخری حصے محلہ قاضی پورہ میں واقع تھی۔ میں کئی روز تک اس کی نگرانی کرتا رہا۔ آخر ایک روز خوش قسمتی سے مجھے موقعہ مل گیا۔ ہوا یوں کہ اس روز اس کے گھر کے سارے افراد اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ باہر سے انہوں نے دروازے میں ایک مضبوط تالا لگا دیا تھا۔ میرے لیے

سنہری موقعہ تھا۔ سردیوں کے دن تھے میں نے رات ہوتے ہی اپنا مخصوص سیاہ چست لباس پہنا اوپر سے سیاہ رنگ کا کوٹ بھی پہن لیا۔ کالے رنگ کی نقاب نما ٹوپی بھی جیب میں رکھ لی، بھرا ہوا پستول چابیوں کے کئی گچھے، تجوریوں کو کھولنے والا اوزار اور ایک جیبی ٹارچ بھی ساتھ لے لی۔ میں رات دس بجے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ کیونکہ رات کا کھانا کافی دیر سے کھانے کا عادی تھا اس لیے بغیر کچھ کھائے پیے ہی نکل گیا۔ امی نے حسب معمول پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ اور یہ کہ جلدی گھر آ جانا۔ میں نے ہمیشہ کی طرح انہیں مطمئن کیا اور باہر نکل آیا۔ مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا میں آدھے گھنٹے کے اندر اندر محلہ قاضی پورہ پہنچ گیا۔

مذکورہ مکان کے عقب سے اندر آسانی سے داخل ہو گیا اور جیسا کہ میرا اندازہ تھا اس کوٹھی سے مجھے کافی مال مل گیا۔ جس میں کچھ زیورات، کئی ہزار کے پرائز بانڈ اور اندازاً پینتیس چالیس ہزار روپے نقد۔ میں بے حد خوش تھا کہ میں نے نہایت اونچا داؤ مارا تھا۔ خیر میں نے جیب سے تھیلا نکالا اور سارا مال اس میں ڈال کر تھیلے کو مضبوطی سے اپنی کمر سے باندھ لیا۔ اس کوٹھی میں اور بھی کئی قیمتی چیزیں تھیں، مثلاً ٹیپ ریکارڈر، ریڈیوگرام، ٹیلی ویژن اور کپڑے وغیرہ، لیکن میں نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ جب میرا کام آسانی سے بن چکا تھا تو میں کیوں بڑی چیزیں لے کر خود کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈالتا، جبکہ مجھے کافی دور اپنے گھر بھی جانا تھا۔ لہٰذا میں نے باقی چیزیں چھوڑ کر پچھلی سمت کی کھڑکی کھولی اور باہر گلی میں کود گیا۔ گلی میں کافی اندھیرا تھا۔ ابھی میں نے جانے کے لیے ایک ہی قدم آگے بڑھایا تھا کہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ تقریباً دس بارہ قدم کے فاصلے پر مجھے ایک ہیولا دکھائی دیا جو میری ہی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ انسانی ہیولا اچانک رک گیا۔ وہ شاید مجھے کھڑکی سے کودتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی جس کا پھل اس اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔

میں ایک بات عرض کر دوں کہ میں بزدل یا ڈرپوک ہرگز نہیں ہوں، میرا کام ہی پولیس سے آنکھ مچولی کھیلنا ہے۔ خطروں سے کھیلنا میری عادت بن چکی ہے، ویسے بھی کسی دوسرے کے گھر میں داخل ہونا کسی معمولی دل گردے کے آدمی کا کام نہیں ہے۔ میرے ساتھ کئی بار ایسا اتفاق ہو چکا تھا کہ چوری کرتے ہوئے گھر کے مکینوں کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش بھی کی لیکن میں انہیں زخمی کر کے فرار ہو گیا۔

میرے سامنے یہ کلہاڑی والا شخص کھڑا تھا، یہ شاید چوکیدار تھا، کیونکہ اس کے ہاتھ میں ٹارچ بھی نظر آ رہی تھی۔ لیکن بہر حال میں خود کو اس کے حوالے تو نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے تو میرے پاس پستول بھی تھا لیکن شیر کی طرح میں اس وقت خون خرابہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ شیر بھی اس وقت جب اس کا پیٹ بھرا ہوا ہو تو کسی سے الجھنا پسند نہیں کرتا، اس وقت جب کہ میرا بھی چوری کے مال سے پیٹ بھرا ہوا تھا تو میں بھی کسی سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔

معاً چوکیدار نے گرج دار آواز میں پوچھا "کون ہو تم۔ وہیں رک جاؤ" یہ کہہ کر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ٹارچ روشن کر دی۔ اب وہاں میرا رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا لہٰذا میں اس کی مخالف سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے کئی بار مجھے چیخ چیخ کر رکنے کو کہا۔ مگر اب میں بھلا کیسے رکتا۔ وہ چور، چور کی آوازیں لگاتا ہوا میرے پیچھے بھاگنے لگا اور میں پکڑے جانے کے خوف سے اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے اپنے پیچھے دھڑا دھڑ دروازوں کے کھلنے کی آوازیں سنی تھیں۔ اب میں اپنے پیچھے کچھ دوسرے لوگوں کے بھاگنے اور چیخنے کی آوازیں بھی سن رہا تھا جو شاید چوکیدار کی مدد کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ میں مختلف گلیوں سے بھاگتے ہوئے اس محلے کے آخری حصے میں ایک سید صاحب کے مکان کی طرف جا نکلا۔ یہ مکان بھی مجھے اس لیے یاد رہ گیا کہ میں اس مکان کے مالک سے کسی حد تک واقف تھا۔ جس کا نام سید علی جان شاہ تھا۔ اس مکان میں ایک بہت اونچا علم لگا ہوا تھا جس میں بجلی کے رنگین قمقمے بھی لگے ہوئے تھے۔ یہ مکان اس محلے کے بالکل آخری حصے میں بنا ہوا تھا لیکن میں اس سے بھی آگے بھاگتا چلا گیا۔ مجھے اب بھی اپنے پیچھے لوگوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اچانک مجھے دائیں ہاتھ پر بنے ہوئے ایک مکان کی کھلی ہوئی کھڑکی نظر آئی۔ کھڑکی کے اندر مکمل اندھیرا تھا، میں نے ایک لمحے کو رک کر پیچھے دیکھا پھر بے اختیار کھڑکی پر چڑھ کر اندر کود گیا اور آہستہ سے کھڑکی بند کر دی۔ بھاگتے بھاگتے میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ لہٰذا میں نیچے

بیٹھ کر اپنا سانس درست کرنے لگا۔ مجھے اب بھی لوگوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، لیکن اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ آوازیں کافی دور سے آ رہی ہیں۔ یہ سوچ کر مجھے اطمینان ہوا کہ فوری خطرہ ٹل چکا ہے۔

آہستہ آہستہ وہ دور سے آتی ہوئی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں۔ میری سانسیں بھی اب اعتدال پر آ چکی تھیں۔ میرے دل کی دھڑکنیں بھی بحال ہو چکی تھیں۔ حالانکہ خطرہ اب ٹل چکا تھا، مگر پھر بھی ایک عجیب بات میں نے محسوس کی ایک عجیب سا خوف میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ جس کا کوئی سبب میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ جس عمارت میں اب میں داخل ہوا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کے مکین باہر سے لوگوں کا شور سن کر جاگ نہ اٹھیں۔ لیکن ابھی تک اس عمارت میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جس سے اندازہ ہوا تھا کہ اس عمارت میں رہنے والوں نے باہر کا شور نہیں سنا وہ شاید گہری نیند میں تھے اور یہ بات میرے حق میں تھی۔

جس کمرے میں اس وقت میں دبکا ہوا تھا اس میں اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دس بارہ منٹ ہو چکے تھے۔ اب باہر سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، جس سے ظاہر تھا کہ وہ لوگ میری تلاش میں ناکام ہو کر اب واپس ہو چکے تھے۔ بظاہر اب دور دور تک کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن نامعلوم خوف کا احساس اب بھی دل پر چھایا ہوا تھا۔

اب جیبی ٹارچ جلانے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے جیب سے پین لائٹ ٹارچ نکالی اور اسے روشن کر دیا۔ یہ عمارت شاید بہت پرانی تھی۔ کیونکہ دیواروں سے جگہ جگہ سے پلستر اتر چکا تھا اور اندر سے خستہ حال سیاہ اینٹیں جھانک رہی تھیں اور ہر جگہ مکڑی کے جالے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جگہ دیوار سے لگی ہوئی ایک قدیم وضع کی الماری نظر آئی جو سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ الماری کے دونوں دروازوں پر نہایت ہی خوب صورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے جو ایک عرصہ گزرنے کی وجہ سے اب ہلکے پڑ گئے تھے۔ بہر حال ساگوان کی لکڑی کی بنی ہوئی یہ الماری کاریگری کا بہترین نمونہ نظر آ رہی تھی۔ الماری کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اور اس میں کچھ کتابیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جو گرد آلود تھیں۔ فرش پر بھی مٹی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میں بے حد حیران ہوا بظاہر یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کمرے میں برسوں سے کوئی نہیں آیا۔ میں نے ٹارچ ذرا گھمائی تو ایک سمت میں شاہ بلوط کی لکڑی کا ایک خوب صورت دروازہ نظر آیا جو شاید اندرونی کمروں میں کھلتا تھا۔ ہر شے پر مٹی کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ فرش پر بھی جگہ جگہ چوہوں کی غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی دوسری سمت ڈالی، اس طرف ویسی ہی قدیم طرز کی ایک بھاری میز دکھائی دی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ذرا اوپر گھمائی تو بری طرح اچھل پڑا اور میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ چند لمحات تک میں ساکت ہو کر رہ گیا، دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ منظر ہی اتنا خوفناک تھا کہ میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا تھا میز کی دوسری طرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ جس پر ایک ڈھانچہ... جی ہاں انسانی ڈھانچہ بیٹھا ہوا تھا، لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے جسم پر پورے کپڑے تھے۔ اس وقت مجھے اس کا چہرہ اور سر وغیرہ نظر آ رہا تھا جو ڈھانچہ کی شکل میں تھا۔ باقی اس کا پورا جسم کپڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی نے ڈھانچہ کو کپڑے پہنا کر کرسی پر بٹھا دیا ہے لیکن کیوں۔ یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آ پاتا تھا۔ میں حیرت زدہ سا کھڑا ڈھانچہ کو گھورے جا رہا تھا۔

میں نے خود پر قابو پا کر ذرا غور سے دیکھا تو وہ کپڑے بھی مجھے بہت قدیم نظر آئے جو وہ ڈھانچہ پہنے ہوئے تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان کپڑوں کا ڈیزائن مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس قسم کے کپڑے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔

تب اچانک مجھے یاد آیا کہ اسی قسم کے کپڑے میں کچھ انگریزی فلموں میں دیکھ چکا ہوں، جن میں پرانی طرز زندگی دکھائی گئی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھا تاکہ ذرا قریب سے جائزہ لے سکوں۔ میں میز کے قریب پہنچا تو مجھے میز پر گرد میں اٹی ہوئی ایک کتاب نظر آئی جو چمڑے کے کور میں بندھی تھی، میں نے اسے میز سے اٹھایا اور کھول کر دیکھا تو حیرت ہوئی۔ اس کے اوراق بے حد بوسیدہ ہو چکے تھے۔ لیکن تحریر اردو تھی میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ ڈائری ہے میں نے اسے جیب میں رکھ لیا کہ فرصت سے دیکھوں گا۔ پھر میں نے ڈرتے ڈرتے ڈھانچہ کی طرف قدم بڑھایا۔ میں اسے قریب سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن مجھے کچھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر میں نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دی کہ بھلا ایک ڈھانچہ سے کیا ڈرنا۔ ظاہر

ہے کہ وہ مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کمرے کا ماحول چکرا دینے والا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو چیخیں مارتا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا۔ یہاں کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کمرے کے حالات میرے لیے غیر متوقع تھے۔ خاص طور پر وہ پراسرار ڈھانچہ۔ اتنا تو ظاہر تھا اسے مرے ہوئے بہت عرصہ گزر چکا ہے اتنا عرصہ کہ اس کا جسم بھی گل سڑ کر ختم ہو چکا ہے اور اب صرف ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ لیکن اتنے لمبے عرصے میں کسی کو اس کے بارے میں علم کیوں نہیں ہوا۔ کیا اسے کسی نے قتل کیا تھا۔ اگر ایسا تھا تو بھی پولیس کو اس کا علم ضرور ہونا چاہیے تھا۔ کم از کم محلے والوں کو تو معلوم ہونا چاہیے تھا۔ جب کہ یہ مکان بھی شہری حدود میں تھا۔ کمرے کی خستہ حالت بتا رہی تھی کہ یہ مکان خالی ہے۔ آخر اس مکان کا مالک کون ہے۔ اس سے ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ اتنے طویل عرصے میں مکان کا مالک بھی یہاں نہیں آیا۔ ورنہ اسے اس ڈھانچہ کا علم ضرور ہوتا۔ اس قسم کے بہت سے سوالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ مگر میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ بہر حال حالات جو بھی تھے میری سمجھ سے بالاتر تھے۔

میں دبے پاؤں آگے بڑھتا ہوا ڈھانچہ کے قریب پہنچا۔ اس کا ایک ہاتھ گود میں رکھا تھا دوسرا نیچے لٹک رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور ڈھانچہ کے کپڑوں کو چھو کر دیکھا، معلوم ہوا کہ اس کے جسم کے کپڑے بھی بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ ہلکے ہلکے خوف کے باوجود میرے دل میں تجسس کا جذبہ بیدار ہو گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اس مکان کو اندر سے ضرور دیکھوں گا، ہو سکتا ہے اس راز سے پردہ اٹھ جائے کم از کم اتنا تو پتہ چلے گا کہ مکان خالی ہے یا اس میں کوئی رہتا ہے یہی سوچ کر میں دبے قدموں اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

کاش، اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے اور یہاں آ کر میں بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤں گا تو میں چوکیدار کے ہاتھوں گرفتار ہونا اور جیل جانا پسند کرتا مگر اس منحوس عمارت میں قدم ہرگز نہ رکھتا، لیکن افسوس ہونی ہو کر رہتی ہے اور کسی کو یہ علم نہیں ہوتا کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔

وہ اندرونی دروازہ بند نہیں تھا صرف بھڑا ہوا تھا۔ میں نے کھولنے کے لیے جیسے ہی اس پر ہاتھ رکھا ویسے ہی شاہ بلوط کا وہ بھاری دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ خود بخود اس طرح کھلتا چلا گیا۔ جیسے میرے ہاتھ لگانے کا منتظر ہو، جیسے ہی دروازہ خود بخود کھلنے لگا۔ میں گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا، خوف کی سرد لہر پورے جسم میں دوڑ گئی، لیکن جلد ہی اس خوف پر تجسس نے غلبہ حاصل کر لیا۔ تھوڑی دیر میں یونہی چپ چاپ کھڑا رہا۔ مجھے ڈر کہ کہیں دروازے کی چرچراہٹ سن کر اندر کے لوگ بیدار نہ ہو جائیں، لیکن اندر اسی طرح مکمل خاموشی چھائی رہی۔ بہر حال میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ دروازہ راہداری میں کھلتا تھا، میں چپکے انداز میں راہداری عبور کرنے لگا۔

راہداری ختم ہوئی تو میں نے خود کو برآمدے میں کھڑا پایا۔ لیکن برآمدے میں پہنچتے ہی حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا مجھے لگا۔ مکان دو منزلہ تھا۔ میرے دائیں ہاتھ پر لکڑی کا ایک کشادہ زینہ اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ زینے کے برابر برابر پانچ کمرے بنے ہوئے تھے، اس کے بعد ایک اور زینہ دکھائی دے رہا تھا اوپری منزل پر بھی چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ نیچے کے دو کمروں میں اور اوپر کے ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ مکان خالی نہیں ہے اور تین کمروں کی روشنی بتا رہی تھی کہ عمارت میں ایک سے زیادہ لوگ رہتے ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دروازے کی چرچراہٹ کی آواز سن کر بھی کوئی نہیں جاگا تھا۔ اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ راہداری میں اور کمروں کے باہر کونوں، کھدروں میں مختلف حشرات الارض نے رہائش اختیار کر لی تھی اور یہاں ہر جگہ چمگادڑوں، چھچھوندروں اور چوہوں کی غلاظت پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور ایک دو جگہ پر اتاری ہوئی کینچلیوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سانپ بھی رہتے ہیں۔

اب میرا تجسس اور بڑھ چکا تھا۔ چند لمحے تو میں اپنی جگہ ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر فلش ٹارچ کی روشنی میں دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ لیکن ایک بات میں نے صاف طور پر پہلے میرے دل و دماغ پر جو ہلکا سا خوف طاری تھا۔ اس میں اب اضافہ ہو چکا تھا۔ اتنا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں رہنے والے لوگوں سے مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ مگر یہ عجیب سا خوف تھا جو آج پہلی بار مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ جوں جوں میں

آگے بڑھ رہا تھا خوف کی لہریں میرے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھیں۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں سی دوڑتی محسوس ہوتی تھیں۔ بڑی عجیب بات تھی کہ لوگوں کے رہنے کے باوجود عمارت پر عجیب سی ویرانی اور سناٹا چھایا تھا۔ نہایت خوفناک عمارت تھی، یوں لگتا تھا جیسے عمارت کے درو دیوار سے خوف اور دہشت کی لہریں نکل رہی ہوں۔

نیچے کا تیسرا اور چوتھا کمرہ روشن تھا۔ دروازے بند تھے لیکن دروازوں اور کھڑکیوں کی درازوں سے ہلکی سی روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں بے آواز چلتا ہوا تیسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا، وہاں رک کر پہلے میں نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور پھر دروازے کی پتلی جھری سے آنکھیں لگا دیں۔ سب سے پہلے میری نظر اس شمع دان پر پڑی، جو کمرے میں بنے ہوئے روشندان کی کارنس پر رکھا ہوا تھا۔ اس میں چار یا پانچ موٹی شمعیں روشن تھیں۔ شمع دان نہایت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب تھا لیکن بے حد پرانی طرز کا معلوم ہوتا تھا اور شمعوں کی روشنی میں سونے کی طرح جگمگا رہا تھا۔ مگر شاید پیتل کا تھا۔ یہ کمرہ کسی حد تک صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر اس کے دیواروں سے بھی پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ ایک کونے میں بے حد پرانی طرز کی ایک شاندار مسہری رکھی ہوئی تھی جو خالی تھی لیکن جونہی میری نظر وسط میں پڑی، میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا، جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور سردی کے باوجود میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ کمرے کے وسط میں ایک عام کتے کے قد کے برابر ایک خونخوار سیاہ رنگ کا بلا زمین پر پڑی ہوئی ایک بڑی سی پلیٹ میں منہ ڈالے دودھ پی رہا تھا، مگر نہیں وہ دودھ نہیں تھا وہ تو خون تھا، پتہ نہیں وہ خون کسی جانور کا تھا یا کسی انسان کا یہ منظر اتنا حیرت ناک تھا کہ میں سر سے پاؤں تک لرز کر رہ گیا۔ دہشت کی سرد لہریں پورے جسم میں دوڑنے لگیں اور دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا قد آور اور خونخوار بلا نہیں دیکھا تھا۔ میں نے کمرے کے دوسرے کونے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر دروازے کی جھری پتلی ہونے کے سبب کمرے کا باقی حصہ نظر نہ آ سکا۔ کوئی دوسری آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کمرے میں اس خوفناک بلے کی موجودگی میں کسی انسان کا ہونا بعید از قیاس لگتا تھا، دوسرے طرف یہ سوال بار بار ذہن میں ڈنک مار رہا تھا کہ بلے کو پینے کے لیے یہ خون کس نے دیا ہے۔

ایک طرف مکان کی ہولناک ویرانی، ڈھانچہ اور اس خونخوار بلے کی موجودگی بتا رہی تھی کہ یہاں کوئی انسان نہیں رہتا۔ دوسری طرف موم بتیوں کا روشن ہونا پلیٹ میں خون کا موجود ہونا اور پڑوس میں دوسرے گھروں کی موجودگی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہاں بھی کوئی نہ کوئی انسان ضرور رہتا ہوگا، لیکن یہ تصور ہی لرزا دینے کے لیے کافی تھا کہ اس مکان میں رہنے والے کی فطرت اور درندگی کا کیا عالم ہوگا جو اس بلے کو خون پلا کر پال رہا تھا۔

میں ابھی سوچوں میں گم تھا اور میری نظر بلے پر لگی ہوئی تھی کہ اچانک نہ جانے کس طرح، بلے کو میری موجودگی کا پتہ چل گیا۔ اس نے خون پیتے پیتے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اف... وہ اس کی خوفناک آنکھیں دیکھ کر میرے بدن میں تھرتھری چھوٹ گئی، یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں دو سرخ شعلے منجمد ہو کر رہ گئے ہوں۔ اس کے منہ سے خون کے قطرے ٹپک ٹپک کر نیچے گر رہے تھے جو ماحول کو اور بھی بھیانک بنا رہے تھے۔ اچانک وہ غرا کر دروازے کی طرف لپکا اور میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں فوراً ہی دروازے سے ہٹ گیا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ دروازہ اور کھڑکی بند تھی ورنہ نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو دل چاہا کہ پراسرار مکان سے فوراً بھاگ جاؤں، لیکن دوسرے ہی لمحے تجسس کے بے پناہ جذبے نے میرے قدم روک لیے۔ میں نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دی کہ رشید، تم تو ایک دلیر انسان ہو تم پہلے بھی کتنے خطرناک مرحلوں سے گزر چکے ہو، تم نے گھبرانا تو سیکھا ہی نہیں، لیکن آج تم ایک بلے اور ایک ڈھانچے سے ڈر کر بھاگ جانا چاہتے ہو، تم تو ویران اور خاص طور پر خالی مکان پسند کرتے ہو تاکہ کوئی تمہاری راہ میں مزاحم نہ ہو سکے اور آج ایک خالی مکان دیکھ کر ڈر رہے ہو حالانکہ تعجب ہے کہ تم اس مکان سے بھی کچھ نہ کچھ چوری کر لو۔ ویسے گھبراؤ مت یقینی طور پر یہاں کوئی نہ کوئی رہتا ضرور ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ روشن شمع دان نہ ہوتے اور پھر بلے کو پینے کے لیے خون کون

دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں نے میرے دل کو بہت ڈھارس بندھائی اور مجھ میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس راز سے پردہ ہٹا کر ہی دم لوں گا اور اس مکان کا جائزہ لے کر ہی یہاں سے جاؤں گا۔

یہ سب سوچ کر میں ایک نئے جوش سے آگے بڑھا اور دوسرے روشن کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا اور دروازے کی ایک درز سے آنکھ لگا دی۔ لیکن کمرے پر نظر ڈالتے ہی میں سر سے لے کر پاؤں تک لرز گیا اور دل جیسے کھوپڑی میں دھڑکنے لگا۔ جسم کے سارے مساموں سے پسینہ پانی کی طرح بہہ نکلا۔ اندر کا منظر اتنا ہولناک تھا کہ میں نے اپنی چیخ بڑی مشکل سے روکی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوفناک کالا ناگ جس کی لمبائی کسی طرح بھی بیس فٹ سے کم نہ ہوگی۔ پرلی طرف دیوار پر نظریں لگائے کسی چیز کو گھور رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سانپ کی نظریں دیوار پر لگی ہوئی ایک بے حد پرانی تصویر کو گھور رہی تھیں۔ میرے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔ اس سانپ کا پھن اندازاً ایک فٹ کے قریب چوڑا تھا اور وہ زمین سے ساڑھے تین فٹ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ وہ سانپ تقریباً سات یا آٹھ انچ کے قریب موٹا تھا۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت تھا اور اس قدر غور سے تصویر کو دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ منظر اس قدر ہوش ربا تھا کہ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی، میری ساری دلیری دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

☆☆☆

دیوانہ ابلیس

عشق کا قاف اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات سے بھرپور، سفلی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی ضوفشانیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دُنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ گمراہی اور اَن دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر جلد آرہا ہے۔**

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر **آپ** ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپکی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف **آپ** بہتر بنا سکتے ہیں۔



میری سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ میں اب بھی یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے، اس طرف میرا دھیان گیا ضرور تھا لیکن مجھے یقین نہ تھا، البتہ اب مجھے یہ احساس شدت سے ہونے لگا کہ یہ مکان خالی ہے، کیونکہ مکان میں ان دو بلاؤں کی موجودگی میں کسی انسان کا رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

درحقیقت میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک تھا کہ ان خوفناک حالات میں بھی یہاں ابھی تک موجود تھا اور کچھ کرنے کا جذبہ رکھتا تھا۔ ورنہ عام آدمی کے لیے تو یہاں دو منٹ رکنا بھی ناممکن تھا۔ حالانکہ ان خطرناک اور خونخوار جانوروں کی موجودگی میرا خون خشک کیے دے رہی تھی لیکن دروازے بند ہونے کی وجہ سے مجھے ان سے فوری خطرہ نہیں تھا۔ پھر بھی خوف اور دہشت نے بری طرح میرے دل اور دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ اسی وقت دنیا کے خوفناک ترین جانور، سانپ نے اپنا پھن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا، یوں جیسے اسے پتہ چل گیا ہو کہ دروازے کے باہر اس کا کوئی دشمن موجود ہے۔ اس کی آنکھیں شیشے کی گولیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ان آنکھوں سے جیسے چنگاریاں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان سلا دینے والی آنکھوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ میرا دماغ متاثر ہو رہا تھا اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ میں نے تو کوئی آواز بھی نہ نکالی نہ ہی کوئی ایسی حرکت کی پھر اسے پتہ کیسے چل گیا کہ باہر کوئی موجود ہے۔

میں نے گھبرا کر اپنی نگاہیں دروازے کی جھری سے ہٹالیں اسی وقت مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے پشت کی طرف سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں بدحواس ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے تیزی سے پیچھے کی طرف دیکھا لیکن وہاں ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین سا ہو گیا کہ کوئی ایسی نادیدہ ہستی تھی ضرور جو مجھے دیکھ رہی تھی، ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی پوشیدہ جگہ چھپا ہوا ہو، ویسے بھی آس پاس کافی اندھیرا تھا اور پنسل ٹارچ کی روشنی اس پورے برآمدے کو روشن کرنے سے قاصر تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ کیونکہ میری چھٹی حس کسی نادیدہ خطرے کا اعلان کر رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا مگر پوری عمارت پر اعصاب شکن سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں ابھی ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ معاً ایک ہولناک چیخ مکان میں گونجی اور میں اس بری طرح اچھل پڑا کہ گرتے گرتے بچا۔ چیخ کی آواز اتنی تیز اور بھیانک تھی کہ میرے ہوش و حواس ایک لمحے کے لیے جواب دے گئے، اور دل اتنی تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی سینے سے باہر آ جائے گا۔ وہ خون سرد کرنے والی دہشت ناک آواز اوپر کے کسی کمرے سے بلند ہوئی تھی۔ یوں جیسے کسی کا گلا کاٹ رہا ہو۔ آہستہ آہستہ وہ آواز سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ آواز بلاشبہ کسی عورت کی تھی۔ ہلکی ہلکی سسکیوں کی دردناک آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں میرا دل ڈوبنے لگا اور دماغ میں ہل چل سی مچ گئی۔

رات کے ہولناک سناٹے میں گونجنے والی ان آوازوں نے میرے ہوش اڑا دیے تھے۔ پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا یہی تھا کہ شاید یہ مکان آسیب کے قبضے میں ہے اور یہ آواز کسی بدروح کی تھی۔ دوسرا خیال یہ آیا کہ مجھے اس ویران اور پراسرار مکان سے فوراً بھاگ جانا چاہیے۔ میں بھاگنے کے لیے مڑا بھی، لیکن اچانک ایک اور خیال نے میرے قدم روک دیے۔

میں سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں اس عمارت میں کچھ لوگوں نے غیر قانونی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہوں اور انہوں نے ہی یہ خوفناک جانور پال رکھے ہوں تاکہ پولیس اور دوسرے لوگ ان کے کاموں میں مداخلت نہ کر سکیں۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ انہوں نے ہی اس عمارت کو ویران بنایا ہوا ہے اور پہلے کمرے میں، یا یوں کہنا چاہیے کہ بیٹھک میں ایک ڈھانچہ رکھ دیا ہے تاکہ لوگ ڈر کے مارے اس عمارت کے قریب بھی نہ آئیں اور

اس طرح ان کی ناپسندیدہ سرگرمیاں لوگوں سے پوشیدہ رہ سکیں، جوں جوں میں اس معاملے پر سوچتا گیا مجھے یقین ہوتا گیا یقیناً یہی بات ہے۔

اس چیخ کا سبب بھی یہی ہوگا کہ وہ لوگ کسی لڑکی کو اغوا کر کے لائے ہوں گے اور اس وقت اس پر تشدد کیا جا رہا ہوگا۔ لیکن پھر بھی یہ عجیب بات تھی کیونکہ اس مکان سے اندازاً تین سو قدم کے فاصلے پر سید علی جان شاہ اور دوسرے لوگوں کے مکان تھے۔ رات کے سناٹے میں لڑکی کی چیخیں دور دور تک پہنچ رہی ہوں گی، اس طرح قریب کے مکانوں والے لوگوں کو تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے پھر وہ لوگ آخر خود کچھ نہیں کر سکتے تو پولیس کی مدد تو حاصل کر سکتے ہیں۔ بہرحال سب کچھ بھی ہو اب میں اتنا بزدل یا کمزور بھی نہیں تھا کہ ایک مظلوم لڑکی کی مدد بھی نہ کر سکوں۔ بہرحال انسانوں کی اس عمارت میں موجودگی نے مجھے کافی تقویت پہنچائی، کیونکہ انسانوں سے نمٹا جا سکتا تھا اور وہ لوگ کافی تھے تو میں بھی مجرم تھا۔ ویسے ڈرنے کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ میرے پاس بھی پستول موجود تھا، لیکن وہ لوگ کافی چالاک تھے کہ میں ابھی تک ان کی موجودگی کا اندازہ نہیں کر سکا تھا لیکن کیا وہ لوگ میری آمد سے باخبر ہو چکے ہیں۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دفعتاً ایک اور چیخ مکان میں ابھری۔ اس چیخ میں نہ جانے ایسے کیا بات تھی کہ میں لرز کر رہ گیا اور ایک بار پھر میرا دل خوف اور دہشت کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ ابھی اس چیخ کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک ہیبت ناک قہقہہ گونجا اور در و دیوار لرز کر رہ گئے۔ یہ ایک مردانہ آواز تھی جس سے میرے اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ یہ آواز اس قدر دہشت انگیز تھی کہ میرے رگ و پے میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میں ایک جھرجھری لے کر آگے بڑھا اور پستول نکال کر میں نے ہاتھ میں لے لیا، میرا رخ بائیں طرف والے زینے کی جانب تھا۔

سسکیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں ابھی تک میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو لکڑی کا بوسیدہ زینہ جھولنے لگا، میں احتیاط سے سیڑھیاں چڑھنے لگا، مجھے ڈر تھا کہ زینہ کہیں بوجھ سے بیٹھ نہ جائے۔ میری ہر قدم پر زینے سے چرچراہٹ کی ڈراؤنی آوازیں نکل رہی تھیں اور میری احتیاط رائگاں جا رہی تھی، کیونکہ زینے سے نکلنے والی آوازوں سے وہ لوگ یقیناً خبردار ہو گئے ہوں گے۔ میں نہایت چوکنے انداز میں زینے کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا مگر پھر بھی مجھے ہر آن یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی کہیں سے کوئی نادیدہ گولی آ کر میرا کام تمام کر دے گی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں سسکیوں کی آوازیں سن رہا تھا، لیکن جب میں اوپر پہنچا تو وہ آوازیں یکبارگی بند ہو گئیں۔ آنے والے لمحات کے تصور سے میرا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے کوئی زخمی پرندہ پنجرے میں پھڑپھڑا رہا ہو۔

اوپر فقط ایک کمرے میں روشنی تھی اور باقی تین کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں بے آواز قدموں سے چلتا ہوا روشن کمرے کی طرف بڑھا، اس وقت میں خود کو ہر قسم کے حالات کے لیے تیار کر لیا تھا۔

میں دروازے پر پہنچا تو وہ بالکل کھلا ہوا تھا۔ میں نے نہایت احتیاط سے کھلے ہوئے دروازے سے جھانک کر اندر دیکھا تو حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا سا لگا۔ کمرہ خالی تھا۔ شاید وہ لوگ زینے سے ابھرنے والی آوازیں سن کر کہیں چھپ گئے تھے البتہ اس کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی ایک ویسی ہی شاندار مسہری رکھی ہوئی تھی، جیسے میں نیچے کے ایک کمرے میں بھی دیکھ چکا تھا۔ مسہری پر کوئی چادر اوڑھے سو رہا تھا اس لیے یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ مرد ہے یا عورت۔

سونے والے کو دیکھ کر پہلا خیال جو ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ سونے والے نے چیخوں کی آوازیں نہیں سنیں کہ وہ ابھی تک لمبی تان کر سو رہا تھا۔ کمرے میں ویسا ہی ایک شمع دان تھا ایسے شمع دان نیچے والے دو کمروں میں بھی رکھے تھے کمرے میں ایک میز اور ایک کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ دونوں ہی سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی تھیں اور بے حد قدیم طرز کی تھیں یہ بات بھی نہایت حیران کن تھی کہ اس عمارت میں اب تک جتنی چیزیں بھی مجھے نظر آئی تھیں وہ سب کی سب بے حد قدیم تھیں۔ لیکن ایک اور بات جس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا، یہ تھی کہ اس کمرے میں صدیوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا اور اندر سے سیاہ اینٹیں جھانک رہی تھیں، چھت اور دیواروں کا رنگ امتداد زمانہ کے باعث سیاہ پڑ چکا تھا، فرش پر مٹی کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں، اوپر نیچے دیواروں اور چھت پر ہر جگہ مہیب مکڑیوں نے جالے تان دیے تھے یوں لگتا تھا جیسے اس

کمرے میں صدیوں سے کسی ذی روح نے قدم نہیں رکھا اور یہ حقیقت بھی تھی کیونکہ اگر کوئی بھی یہاں آتا تو فرش کی مٹی پر اس کے قدموں کے نشان ضرور نظر آتے، جب کہ پورے کمرے میں ایسا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ حتیٰ کہ چوہوں اور دوسرے حشرات الارض کے نشانات بھی مفقود تھے۔

حیرت سے میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے تھے اور میرا ذہن بے شمار خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا تو پھر چیخ اور قہقہوں کی وہ آوازیں کہاں سے آئی تھیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسہری پر سونے والا اس کمرے میں کیسے داخل ہوا۔

میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا، اور پھر سب سے عجیب بات، جس نے میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا تھا کہ کرسی، میز اور مسہری اس طرح صاف نظر آ رہی تھی جیسے انہیں کوئی استعمال کرتا رہا ہے اور تو اور مسہری پر جو کوئی سو رہا تھا، اس کے اوپر اتنی صاف اور اجلی چادر دکھائی دے رہی تھی کہ اس پر داغ دھبہ تو دور کی بات ہے ہلکی سی شکن تک نہ تھی۔ میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اب شک ہونے لگا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے کیونکہ اس مکان کی کوئی چیز بھی ترتیب سے نہ تھی۔ چیخ کی آواز سے ظاہر تھا کہ یہاں کوئی تھا ضرور، تو کیا وہ آوازیں دوسرے کمروں سے آئی تھیں۔ لیکن پھر اس کمرے کی میز کرسی اور مسہری کی صفائی کس نے کی اور کب۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یہاں رہنے والے کس قسم کے لوگ ہیں کہ انہوں نے میز کرسی کی صفائی کی لیکن باقی کمرے کو ایسا ہی چھوڑ دیا۔ کمرے کی پراسرار حالت دیکھ کر میرا دل جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس سارے معاملے میں یقیناً کوئی نادیدہ قوت کارفرما ہے۔

میں نے بمشکل خود پر قابو پایا اور خدا کا نام لے کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ پستول میرے دائیں ہاتھ میں تھا اور میری آنکھیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ دبے پاؤں چلتا ہوا میں وسط میں رکھی ہوئی میز کے پاس آ کر رک گیا۔ کمرہ کافی کشادہ تھا، وہ تقریباً پندرہ فٹ ہم چوڑا اور اتنا ہی اونچا تھا۔ پہلے میں نے مسہری پر سوئے ہوئے بے خبر شخص کی طرف دیکھا، پھر چوکنے انداز میں چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور پھر میری نظریں، اس پراسرار اور قدیم شمع دان پر آ کر جم گئیں۔ اس میں پانچ انچ لمبی موم بتیاں روشن تھیں اور اس سفید روشنی میں وہ دیدہ زیب اور خوب صورت شمع دان سونے کی طرح جگمگ، جگمگ کر رہا تھا۔ یہ شمع دان کمرے میں موجود ایک قدیم طرز کے آتش دان کے اوپر بنی ہوئی کارنس پر رکھا تھا۔ میں ٹکٹکی لگائے شمع دان کو دیکھنے لگا۔

ویسے اصولی طور پر سب سے پہلے مجھے سونے والے کے بارے میں جاننا چاہیے تھا، جو اتنی بھیانک آوازوں میں بھی آرام سے سویا ہوا تھا، لیکن شمع دان میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دور سے وہ سونے کا نظر آ رہا تھا۔ میں چند قدم اور آگے بڑھا تاکہ قریب سے دیکھ سکوں کہ وہ سونے کا ہے یا پیتل کا۔ کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر میں شمع دان کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ شمع دان صدیوں پرانا اور نایاب تھا۔ اس پر نہایت حسین نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا تو خوشی سے میرا دل دھڑک اٹھا اور تھوڑی دیر کے لیے میں سب کچھ بھول گیا۔ وہ شمع دان یقینی طور پر سونے کا تھا اور اگر میرا اندازہ درست تھا تو اس کا وزن ایک سیر سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ایسے ہی دو شمع دان، پیچھے کے دو کمرے میں بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں بلاشرکت غیرے، تین سیر سونے کا مالک بن چکا تھا۔ ایک لمحے کو میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں میں اسے پرکھنے میں غلطی تو نہیں کر رہا۔ میں ایک جوہری تھا اور میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں، وہ یقینی طور پر سونا تھا، بہترین اور خالص سونا، میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ واقعی لالچ بہت بڑی بلا ہے۔

میں تھوڑی دیر قبل کی وہ خوفناک صورت حال بالکل بھول چکا تھا۔ مجھے نہ وہ وحشت ناک چیخیں یاد رہیں، نہ قہقہے یاد رہے، نہ ہی وہ مسہری پر سونے والا حیرت انگیز انسان، یاد رہا۔ میں نے پستول بائیں ہاتھ میں لیا اور دایاں ہاتھ شمع دان کی طرف بڑھایا تاکہ اسے اٹھا کر، وزن کا صحیح اندازہ کر سکوں لیکن اسی وقت میری نظر موم بتیوں کے شعلوں پر پڑی اور میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا، عجیب بات تھی کہ وہ شعلے بالکل ساکت تھے، حالانکہ ہوا کے زور سے ان شعلوں کو رقص کرنا چاہیے تھا، لیکن یہ شعلے نرالے تھے، وہ اس طرح ساکت تھے جیسے موم بتیوں کے نہ ہوں بلکہ بجلی کے ہوں۔ یہ ایک غیر فطری بات تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل بے اختیار دھڑک اٹھا اور میں مبہوت ہو

کر رہ گیا۔ میری نظریں ان عجیب وغریب ساکت شعلوں پر جمی ہوئی تھیں اسی وقت پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی پیچھے سے مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے ہو۔ ایک لمحے کے لیے میرے خون کی گردش جیسے رک گئی اور اعصاب جواب دے گئے۔ میں ایک دم پیچھے گھوما لیکن کمرے میں ہولناک ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پورے کمرے بلکہ مکان پر اعصاب شکن خاموشی اور دماغ پاش سناٹے کے روح فرسا لمحوں کے سحر کے سوا صرف مختلف حشرات الارض کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بظاہر تو وہاں کچھ نہ تھا مگر مجھے پورا پورا یقین تھا کہ کوئی مجھے ضرور دیکھ رہا تھا۔ یقیناً کوئی غیبی قوت مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ لیکن مجھے یوں لگتا تھا کہ اس پراسرار عمارت کے درودیوار مجھے گھور رہے ہوں۔

البتہ سونے والا اسی طرح سو رہا تھا۔ اس عرصے میں نہ چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی نہ سسکیوں کی، اب میری نظریں مسہری پر لگی ہوئی تھیں دل اور دماغ میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ سونے والے کے بارے میں کئی سوالات ذہن میں گونج رہے تھے اور میں ہر قسم کی صورت حال کے لیے خود کو تیار کرتا آہستہ آہستہ مسہری کی طرف بڑھنے لگا تاکہ چادر اتار کر دیکھوں کہ کون سو رہا ہے۔ لیکن ابھی میں مسہری سے کچھ دور ہی تھا کہ اچانک دروازے کے چرچرانے کی آواز سن کر سرتاپا لرز کر رہ گیا اور میرے بڑھتے ہوئے قدم فوراً رک گئے۔ تیزی سے مڑ کر جونہی میں نے دروازے کی طرف دیکھا تو اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی کی رہ گئیں اور دل جیسے دہشت اور خوف کے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ شاہ بلوط کی لکڑی کا وہ بھاری دروازہ، چرچراہٹ کی بھیانک آواز کے ساتھ آپ ہی آپ بند ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے جسم کا خون جیسے خشک ہو چکا تھا۔ جب دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا تو مجھے اچانک جیسے ہوش آ گیا۔ میں بھاگتا ہوا دروازے پر پہنچا اور اسے کھولنے کی دیوانہ وار کوشش کرنے لگا، مگر بے سود یوں لگتا تھا جیسے دروازہ کسی نے باہر سے بند کر دیا ہو، لیکن میں کھلی آنکھوں سے دروازے کو خود بخود بند ہوتے دیکھ چکا تھا۔ اب تو میں بری طرح گھبرا گیا، اب شک وشبے کی گنجائش نہ رہی تھی کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ آسیب کا خیال آتے ہی میری پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ بچپن میں سنی ہوئی، جن بھوتوں اور چڑیلوں کی بیسوں کہانیاں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں اور بے اختیار میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

اب مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا کہ یہاں آ کر مجھ سے زبردست بھول ہوئی ہے۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مگر نہیں، مجھے اب بھی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن کس طرح۔ میں نے چاروں طرف کمرے میں نظر دوڑائی، بس لے دے کر ایک کھڑکی ہی تھی جو عمارت کے عقب میں کھلتی تھی میں بے اختیار کھڑکی کے پاس پہنچا اور اسے کھولا تو زمین پچیس تیس فٹ نیچے نظر آئی، یعنی کھڑکی کے راستے نیچے پہنچنا بھی ممکن نہیں تھا، کیونکہ رسی وغیرہ بھی نہ تھی اور ظاہر ہے کہ چھلانگ بھی نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ میں بے چین ہو کر کھڑکی کے دائیں طرف دیکھا تو تھوڑے فاصلے پر دوسرے کمرے کی کھڑکی نظر آئی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ کھڑکیوں کے اوپر نیچے چھجے سے بنے ہوئے تھے۔ جس کے ذریعے دوسری کھڑکی تک پہنچا جا سکتا تھا۔ میں کسی حد تک مطمئن ہو گیا کہ خطرے کے وقت کم از کم اس کمرے سے نکلا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بھیانک عمارت، میرے لیے ایک ایسا قید خانہ بن چکی ہے۔ جہاں سے نکلنا بے حد مشکل ہوگا، لیکن میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کمرے سے نکل کر میں دوسرے کمرے میں ہی جا سکتا تھا اس عمارت سے تو نہیں نکل سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگتا تھا کہ میں ایک ایسی بھول بھلیوں میں پھنس چکا تھا جس کا ہر راستہ جہنم کی طرف جاتا ہے۔

معاً پھر مسہری پر سونے والے کا خیال آیا اور میں کھڑکی سے پلٹ کر مسہری کی طرف بڑھا۔ مسہری کے پاس پہنچ کر میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا اور اس کے سر سے چادر ہٹا دی۔ لیکن چادر ہٹتے ہی بے اختیار میرے منہ سے تیز چیخ نکل گئی اور میں بری طرح اچھل کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مارے دہشت کے میرا روں رواں کانپ اٹھا، آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور میرے حواس جواب دے گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک عورت کی لاش تھی، لیکن اس حالت میں کہ اس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور خون اس تیزی سے نکل رہا تھا جیسے اسے ابھی ابھی قتل کیا گیا ہو۔ اس کی کٹی ہوئی گردن کے مختلف حصے پھڑک رہے تھے، لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کا سر غائب تھا۔

تو کیا وہ چیخیں اس عورت کی تھیں۔ مگر وہ آوازیں تو کچھ دیر قبل سنائی دی تھیں، جبکہ تیزی سے ابلتا ہوا خون بتا رہا تھا کہ اس عورت کو تین چار

منٹ پہلے قتل کیا گیا ہے۔ میرا دل کھوپڑی میں دھڑکنے لگا، اور جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ اس وقت مجھ پر جو کچھ گزر رہی تھی۔ اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

میرا دماغ سن ہو چکا تھا اور سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں بے کار ہو چکی تھیں۔ ظاہر تھا کہ عورت کو اسی وقت قتل کیا گیا ہے۔ مگر کیسے۔ یہاں تو میرے علاوہ کوئی دوسرا آیا ہی نہیں، میں کافی دیر سے اس کمرے میں موجود تھا جس وقت میں نے وہ چیخیں سنی تھیں اگر اس عورت کو اس وقت قتل کیا گیا ہوتا تو اس وقت تک عورت کا سارا خون نکل چکا ہوتا نہیں یہ ناممکن ہے اس کو ابھی ابھی قتل کیا گیا ہے۔ مگر قتل کس نے کیا۔ کیا وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی تھی۔ جو مجھے نظر نہ آ سکی۔ یقیناً یہی بات ہے، لیکن اس کا سر تو یہیں ہونا چاہیے تھا۔ تو کیا قاتل سر بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا، اب مجھے اپنی زندگی بھی خطرے میں نظر آنے لگی۔ یہ نادیدہ قاتل تو مجھے بھی قتل کر سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں بے اختیار بھاگتا ہوا ایک بار پھر دروازے پر گیا اور اس سے زور آزمائی کرنے لگا، مگر دروازے کو نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔

اب میں بری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا مجھ میں لاش کو دوبارہ دیکھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ نہ اتنی ہمت تھی کہ اسے پھر چادر سے ڈھانپ دیتا۔ یا الٰہی اب میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔ اس خطرناک جگہ پر تو میں آرام سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا بیٹھنا تو دور کی بات ہے۔

میں میز کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں، کہاں جاؤں، میں انہیں سوچوں میں گم تھا کہ معاً میری نظر فرش پر پڑی اور میں اس طرح چونک کر پیچھے ہٹا، جیسے میرے آگے موت کھڑی ہو، وہ منظر ہی اتنا انوکھا اور حیرت ناک تھا۔ کہ میرے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر فرش کی مٹی پر پُراسرار انسانی قدموں کے نشانات بنتے چلے جا رہے تھے، یوں جیسے کوئی انسان فرش پر چل رہا ہو مگر وہاں کوئی انسان تو کیا، ایک مکھی تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ کمرہ بالکل خالی تھا، مگر نشان برابر بنتے چلے جا رہے تھے، اس طرح کہ آگے آگے نشان بنتے جا رہے تھی اور پیچھے سے مٹتے جا رہے تھے۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان عجیب و غریب نشانوں کو دیکھ رہا تھا جو کمرے کے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ میرا دل خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا اور آنکھیں جیسے حلقوں سے باہر نکل پڑ رہی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ نشان دروازے تک پہنچا، اچانک دروازہ کھلا، جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے کھولا ہو، اور نشانات باہر نکلتے چلے گئے۔ دروازہ اب آہستہ آہستہ بند ہونے لگا، یکایک مجھے بھی خیال آیا کہ یہ میرے لیے سنہری موقع ہے مجھے بھاگ جانا چاہیے، میں بجلی کی تیزی سے بھاگتا ہوا دروازہ تک پہنچا تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا اور میں اپنے ہی زور سے دروازے سے ٹکرا گیا اور نیچے گر پڑا۔ کافی زور کی چوٹ لگی تھی، چند منٹ تک تو اٹھنے کی سکت ہی نہ رہی اور میں اسی طرح زمین پر پڑے پڑے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

میں کچھ اس انداز میں زمین پر گرا ہوا تھا کہ میری پشت دروازے کی طرف تھی اور میرا چہرہ میز، کرسی اور مسہری کی طرف تھا۔ دفعتاً خوف سے میری بری حالت ہو گئی جب میں نے ایک لمبے سانپ کو مسہری کے نیچے سے نکلتے دیکھا، جو دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں میں گرا ہوا تھا۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

فاصلوں کا زہر

طاہر جاوید مغل کا خوبصورت ناول۔ محبت جیسے لازوال جذبے کا بیان۔ دیارِ غیر میں رہنے والوں کا اپنے دیس اور وطن سے تعلق اور ٹوٹتے رشتوں پر مشتمل ایک خوبصورت تحریر۔ ان لوگوں کا احوال جو کہیں بھی جائیں، اپنا وطن اور اپنا اصل ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ ناول فاصلوں کا زہر بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے **رومانی معاشرتی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

حالانکہ روشنی کافی تیز تھی، لیکن میں اسے سانپ ہی سمجھا تھا، مگر اب جو غور سے دیکھا تو وہ خون کا ریلا تھا، جو عورت کے جسم سے بہہ کر مسہری کے نیچے جمع ہو گیا تھا اور اب وہاں سے ریلے کی شکل میں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری جان میں جان آئی اور میں دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا، مگر یہ اطمینان کا فقط ایک لمحہ تھا جو مجھے نصیب ہوا، دوسرے ہی لمحے میرے ہوش اڑ گئے جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ خون دروازے سے ہٹ کر میری طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اب بھی وہ منظر میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔

میں چیخیں مارتا ہوا چاروں طرف گھوم رہا تھا اور وہ خون سانپ کی مانند میرا پیچھا کر رہا تھا، مگر میں بھاگ کر جاتا بھی تو کہاں جاتا، کوئی جائے پناہ تو نہیں تھی۔ لہٰذا کچھ دیر تو میں دیوانوں کی طرح بھاگتا رہا، پھر بے اختیار ہو کر کھڑکی پر چڑھا اور احتیاط سے چھجے پر پاؤں رکھتا ہوا، دوسرے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ ہر آن مجھے یہی خوف رہا کہ چھجا ٹوٹ نہ جائے کیونکہ عمارت بے حد قدیم تھی، مگر شاید قدرت کو میری زندگی منظور تھی کہ یہ داستان آپ کو سنانے کے لیے زندہ بچ گیا۔

ویسے یہ بات تو ظاہر ہے کہ وہ خون مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا، لیکن اس وقت خوف اور دہشت نے کچھ اس طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا کہ میرے ہوش گم تھے اور بھاگنے کے سوا مجھے کچھ اور نہیں سوجھ رہا تھا۔

میں آسانی سے کھڑکی میں سے گزر کر دوسرے نمبر کے کمرے میں کود گیا۔ میں نے پنسل ٹارچ جلا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر دل کو کافی اطمینان ہوا کہ کمرہ خالی تھا، لیکن اس شیطانی عمارت کے چپے چپے پر دہشت کی حکمرانی تھی اس عمارت میں کچھ بھی امید نہ تھا، یہاں کسی لمحے بھی کچھ نہ کچھ ہو سکتا تھا۔

کچھ دیر تک میں ایک جگہ کھڑا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ پے در پے ہونے والے ان دہشت ناک واقعات نے میری جان نکال دی تھی اور ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت بھی نہ تھی۔ دماغ ابھی تک سنسنا رہا تھا اور دل قابو میں نہ تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ایسی بھیانک عمارت کو محلے والوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

اس کمرے میں مکمل اندھیرا تھا لہٰذا میں نے ٹارچ روشن کیے رکھی۔ یہ کمرہ پہلے کمرے کی نسبت کچھ صاف تھا۔ گو یہاں پر رکھی ہوئی سب چیزیں بھی گرد آلود تھیں۔ فرش پر مٹی بھی جمی ہوئی تھی۔ دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا مگر یہاں مکڑی کے جالے بہت کم تھے۔ ایک جگہ کارنس پر ویسا ہی پراسرار شمع دان رکھا ہوا تھا۔ اس میں بالکل سالم شمعیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ چونکہ پنسل ٹارچ کی روشنی محدود تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شمع دان کو جلانا چاہیے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کیسے جلاؤں۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس موجود ہے۔ میں نے ماچس نکال کر تیلی جلائی اور شمع دان کی طرف بڑھا۔ مگر بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ ان عجیب و غریب موم بتیوں کے شعلے ساکت رہتے ہیں اور عام شعلوں کی طرح ان پر ہوا کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی وقت جلتی ہوئی تیلی انگلیوں کو جلانے لگی اور میں نے گھبرا کر اسے پھینک دیا۔

میں سوچنے لگا کہ یہ شمع دان بھی یقیناً شیطانی قوت کے زیر اثر ہیں تبھی تو ان کے شعلے، عام شعلوں کی طرح گھٹتے بڑھتے نہیں ہیں، ورنہ ہوا چاہے بالکل ہی رکی ہوئی کیوں نہ ہو پھر بھی عام شعلے رقص کرتے رہتے ہیں۔

حالانکہ یہ شمع دان سونے کے تھے مگر اب ان سے بھی مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ٹارچ مسلسل روشن رہی تو اس کے سیل جلد ہی ختم ہو جائیں گے اور پھر ٹارچ کی روشنی اتنے بڑے کمرے کا احاطہ کرنے میں ناکام تھی، پھر مکان میں مجھے نہ جانے کتنی دیر رکنا پڑے، اس لیے مجھے کوشش کرنی چاہیے۔ لہٰذا میں نے پھر ایک تیلی جلائی اور ڈرتے ڈرتے ایک موم بتی روشن کر دی، مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس ایک موم بتی کے شعلے نے پھیل کر چاروں موم بتیوں کو روشن کر دیا، پھر پانچوں موم بتیاں روشن ہوتے ہی ان کے شعلے اس طرح ساکت ہو گئے جیسے وہ بجلی کے ہوں۔

پہلے جب لوگ آسیب اور جن بھوتوں کی باتیں کیا کرتے تھے تو میں ان پر ہنستا تھا، لیکن اب جب کہ خود میرا ان سے واسطہ پڑا تو پتہ چلا تھا کہ آسیب کیا چیز ہوتی ہے۔ خدا ایسے برے لمحے دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ آج کی رات مجھ پر جو کچھ گزری تھی، اس کا ایک ایک لمحہ میرے لیے ناقابل بیان اذیت تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس پراسرار عمارت کے یہ جن بھوت اگر مجھے مارنا ہی چاہتے ہیں تو ایک دم ہلاک کیوں نہیں کر دیتے یہ مجھے تڑپا تڑپا کر کیوں مارنا چاہتے ہیں۔ اس منحوس عمارت کی ہر چیز پراسرار تھی، پراسرار اور انوکھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر میں یہاں سے زندہ بچ کر نکل گیا تو بلاشبہ وہ میری نئی زندگی ہوگی۔ مگر مجھے ایسی کوئی امید نہ تھی کہ میں یہاں سے زندہ وسلامت واپس جا سکوں گا۔

شمع دان کی روشنی میں کمرہ اب صاف نظر آ رہا تھا، ایک طرف سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی الماری رکھی تھی جس کے دروازے بند تھے، اس کے دروازوں پر خوب صورت نقش ونگار بنے ہوئے تھے، درمیان میں ایک بھاری میز اور اس کے گرد دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف دیوار میں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا جو شاید تیسرے کمرے میں کھلتا ہوگا، میں نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا تو اندر سے اس کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں پہلے ہی بہت خوف زدہ تھا لہذا میں نے پہلے دروازے کی کنڈی اندر سے لگا دی تاکہ کوئی اور مصیبت اندر داخل نہ ہونے پائے۔ میں واپس آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس بھاگ دوڑ نے مجھے بے حد تھکا دیا تھا اور رہی سہی کسر خوف اور دہشت نے پوری کر دی تھی، اب چند لمحات مجھے سکون کے ملے تو بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔

مجھے بڑی شدت کی بھوک لگی تھی، کاش میں گھر سے کھانا کھا کر آتا، مگر اب برداشت کرتا تھا۔ اسی وقت میری نظر بند الماری پر پڑی اور میرا تجسس جاگ اٹھا میں نے سوچا کہ اسے کھول کر دیکھنا چاہیے، ممکن ہے اس میں ہیرے جواہرات یا اور کوئی قیمتی چیز بند ہو۔ اس وقت پہلی بار مجھے علم ہوا کہ انسان فطری طور پر لالچی ہوتا ہے۔ حالانکہ اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی مگر ایسے خوفناک حالات میں بھی مجھے ہیرے جواہرات کی تمنا تھی۔

میں کرسی سے اٹھ کر الماری کے قریب پہنچا تو چونک گیا، الماری کے دونوں پٹ بند تھے مگر اس کی کنڈی پر ایک خوفناک سیاہ مکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور میں کانپ کر رہ گیا۔ عام حالات میں شاید نہ ڈرتا مگر اس پراسرار عمارت میں ہر طرف موت ہی موت مختلف شکلوں میں گھوم رہی تھی۔ اس لیے اب مجھے عمارت کا چپہ چپہ دشمن لگ رہا تھا۔ لہذا اس عجیب مکڑی کو دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا۔ ویسے بھی یہ پراسرار مکڑی جسامت میں کافی بڑی تھی۔ اندازاً چھ انچ کے قریب۔ ویسے الماری کھولنے کی مجھے خاص ضرورت تو نہ تھی مگر اس مکڑی کی موجودگی میں یہاں مجھے سکون کیسے مل سکتا تھا۔ لہذا میں نے ہاتھ ہلا کر اسے بھگانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں ہاتھ ہلا ہلا کر تھک گیا لیکن وہ کریہہ مکڑی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اب تو مجھے اور زیادہ خوف محسوس ہوا کہ آخر اس مکڑی کی مرضی کیا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ اس کمرے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی، جس سے میں مکڑی کو بھگا سکتا، ادھر میں اس کے قریب بھی جانا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے قریب پا کر مجھ پر حملہ کر دیتی۔ ویسے سچی بات یہ تھی کہ اس آسیب زدہ عمارت میں رونما ہونے والے پے در پے واقعات نے مجھے اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ اب میں اپنے اندر اس مکڑی سے مقابلہ کرنے کی بھی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

دوسری طرف، اس بھاگ دوڑ اور حیرت ناک واقعات نے میرے جسم کا سارا خون خشک کر دیا تھا، اب بھوک پیاس، خوف اور دہشت نے میرے جسم سے جیسے ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔ اس لیے میں زیادہ اچھل کود بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر یہ مکڑی الماری کی کنڈی سے اس طرح چمٹی ہوئی کہ کہیں ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی

اچانک ایک نئے خیال نے مجھے اور دہشت زدہ کر دیا میں سوچنے لگا کہ ایسا تو نہیں کہ اس پراسرار عمارت کی مافوق الفطرت قوتوں نے اس مکڑی کو اس الماری کی حفاظت پر مامور کر دیا ہو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ الماری میں کوئی ایسی چیز ہے، جو قیمتی ہو سکتی ہے۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس مکڑی کو صرف مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو۔

بہرحال، میں نے اسے ہٹانے کی بے حد کوشش کی، مگر وہ کمبخت ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ بڑی دیدہ دلیر مکڑی تھی۔ آخرکار جب میں اسے ہٹانے میں ناکام ہوگیا تو آخری چارے کے طور پر میں نے کرسی اٹھائی جو بہت بھاری تھی، اور اس کا ایک پایا مکڑی پر دے مارا۔ مگر اس وقت میں حیرت زدہ رہ گیا۔ جب کہ یہ مکڑی پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی اور تو اور، اس پر اس چوٹ کا بھی کوئی اثر نہ ہوا، اس پر چوٹ کراری پڑی تھی۔ عام مکڑی کا تو بھرکس نکل چکا ہوتا کم از کم وہ پچک ضرور جاتی مگر یہ تو جیسے لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ لوہے کے نام پر میرے ذہن میں جیسے بجلی سی کوندگئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ واقعی لوہے کی تو بنی ہوئی نہیں ہے۔ احتیاط کے طور پر میں نے اس پر دو تین وار کیے، پھر اسے ایک پائے سے رگیدا بھی، تب مجھے احساس ہوا کہ وہ واقعی لوہے کی بنی ہوئی ایک بے جان مکڑی تھی۔ مت پوچھیے کہ اس وقت میں دل ہی دل میں کتنا شرمندہ ہوا جب مجھے پتہ چلا کہ میں پرانے زمانے کے ایک عجیب و غریب قفل پر طاقت آزمائی کرتا رہا ہوں۔ شرم سے میری پیشانی عرق آلود ہوگئی اور مجھ پر یہ راز کھلا بھی تو اس وقت، جب میں اس تھوڑی ہی کوشش میں بھی بہت تھک چکا تھا۔

بہرحال جب مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ یہ نرالی ڈیزائن کا تالا ہے تو پھر میں نے اپنے اوزار نکالے اور اسے کھولنے کی کوششیں شروع کردیں۔ لگاتار پندرہ، بیس منٹ کے بعد ہی میں اسے کھولنے میں کامیاب ہوسکا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے الماری کے دروازے کو ہاتھ لگایا۔ لیکن جب میں نے دروازہ کھولا تو مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اندر سے کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو آرہی تھی۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ الماری میں کل چار خانے تھے اور یہ کھانا اوپر سے دوسرے نمبر کے خانے میں ایک صاف کپڑے سے ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ باقی الماری خالی تھی۔ کھانے کی خوشبو اتنی پیاری تھی کہ میری بھوک، یک بیک، بہت بڑھ گئی۔

مجھے اپنی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔ بھلا صدیوں سے بند الماری میں کھانا کہاں سے آیا۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ مگر اشتہا انگیز خوشبو، برابر میری ناک میں آرہی تھی، اور میرے معدے میں بھوک کے مارے آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔

بہت سے خیالات میرے دماغ میں آکر گزر گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ سراب تو نہیں ہے۔ جیسے صحرا میں بھٹکے ہوئے پیاسے لوگوں کو ریت کے ذرات میں اکثر دریا کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے، لیکن درحقیقت وہ پانی نہیں ہوتا۔ کم از کم اس وقت میری حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی، کہ بھوک لحہ بہ لحہ ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھی۔ مگر مجھے صدیوں سے ویران اس خالی عمارت میں، مزیدار اور تازہ کھانے کی خوشبو آرہی تھی۔ میرا دماغ گھومنے لگا۔ لیکن میں نے یہ بھی سوچا کہ شاید عمارت کے پراسرار مکینوں کو، میری حالت پر رحم آگیا ہو، آخر جب برداشت کا یارا نہ رہا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر، ڈرتے ڈرتے، کھانے پر پڑا ہوا کپڑا ہٹادیا۔

اس وقت میری حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، میری آنکھیں، پھٹی کی پھٹی رہ گئیں تھیں۔ مارے حیرت کے میری حالت عجیب ہوگئی تھی۔ درحقیقت مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہورہا تھا۔ میرے سامنے ایک بڑی سی ٹرے میں کئی پلیٹیں کھانے سے بھری ہوئی رکھی تھیں، جن میں تکے کباب، کوفتے، گوشت کا سالن روٹیاں، اور چند ایک دوسری چیزیں شامل تھیں اور سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ کھانا گرم تھا، جس کی آنچ مجھے صاف طور پر محسوس ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر قبل کے عبرت انگیز واقعات، پس منظر میں چلے گئے اور میں نے ساری احتیاط بالائے طاق رکھ دی اور کھانا الماری سے اٹھا کر میز پر لے آیا اور بے اختیار کھانا شروع کردیا۔

میں نے سوچا تھا کہ آسیبی عمارت سے میرا زندہ نکلنا ناممکن ہے، جب مجھے مرنا ہی ہے تو کیوں نہ کچھ کھا کر مروں۔ پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ آگے نہ جانے کیا حالات پیش آئیں، اس لیے جس میں کچھ توانائی ہو۔ وہ کھانا اتنا لذیذ تھا کہ اس کی تعریف کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نا کافی ہیں، ایسا مزے دار اور لذیذ کھانا میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں کھایا تھا۔ خاص طور پر گوشت نہ جانے کس چیز کا تھا، اس گوشت کی بے مثال لذت یہ بتارہی تھی جیسے آج تک میں گوشت کے نام پر گھاس کھاتا رہا ہوں۔ وہ سب کی سب چیزیں ایک دوسرے سے زیادہ لذیذ تھیں۔ نہ جانے کس نے یہ کھانا پکایا تھا کہ بے اختیار پکانے والے کے ہاتھ چومنے کو جی چاہتا تھا۔

بے شک یہ عمارت خوفناک تھی، اور یہاں مجھے حد سے زیادہ اذیت برداشت کرنی پڑی تھی، لیکن اس لاجواب کھانے نے ساری تکلیف کا ازالہ کر دیا تھا اور گوشت نے تو میرا دل خوش کر دیا۔ لہٰذا اب مجھے موت کا بھی غم نہ تھا۔

ابھی میں نے چند ہی لقمے کھائے تھے کہ پہلی بار وہ عجیب آواز مجھے سنائی دی، آواز بہت ہلکی تھی، زوں زوں، زوں زوں ہو سکتا ہے وہ آواز شروع ہی سے آ رہی ہو مگر میں نے اپنی پریشانی میں اسے نہ سنا ہو۔

ایک بار تو میں کھاتے کھاتے رک بھی گیا، نہایت حیرت انگیز آواز تھی اور اس سناٹے میں بڑی پراسرار لگ رہی تھی، یوں جیسے اوپر سے کوئی ہوائی جہاز گزر رہا ہو۔ لیکن بہر حال میں نے زیادہ غور نہیں کیا اور بدستور کھانا کھاتا رہا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ آواز کچھ اور تیز ہو گئی ہے، مگر میں اب بھی کھانے میں معروف رہا اور اس وقت میں تقریباً آدھی پلیٹیں صاف کر چکا تھا اور حقیقت کھانا، دو تین آدمیوں کا تھا، مگر اول تو مجھے بھوک بڑے زور کی لگی تھی، دوسرے کھانا لذیذ ہونے کی وجہ سے میں کھاتا ہی جا رہا تھا۔ جب میں نے تقریباً آدھا کھانا کھا لیا تو سالن کی پلیٹ سے ایک عجیب بوٹی میرے ہاتھ میں آئی وہ لمبی لمبی سی نہایت ہی عجیب بوٹی تھی۔ میں بہت حیران ہوا، کیونکہ وہ تھی تو ہڈی جیسی لیکن کسی حد تک گوشت کی طرح نرم بھی تھی۔ میں نے ذرا غور سے بوٹی کو دیکھا تو دہشت کی وجہ سے میری آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ نوالہ منہ سے نکل کر نیچے گر پڑا، ہاتھ سے بوٹی چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ ایک بھیانک چیخ میرے منہ سے نکلی اور میں اچھل کر اس طرح کرسی سے اٹھا جیسے بھولے سے سانپ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بوٹی نہ تھی بلکہ ایک انسانی انگلی تھی جس میں ابھی تک ناخن لگا ہوا تھا۔ میرے ہوش و حواس پر جیسے بجلی سی گر پڑی اور میری روح تک لرز اٹھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اب تک انسانی گوشت کھا تا رہا تھا۔

یہ خیال نہایت دل خراش، اذیت ناک اور دماغ پاش تھا۔ فوراً ہی مجھے قے ہو گئی۔ پھر جو الٹیاں شروع ہوئیں تو مسلسل جاری رہیں۔ کچھ مت پوچھئے کہ اس وقت مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔ دماغ میں جیسے آندھیاں سی چل رہی تھیں اور دل پر جیسے چھریاں...... قے کر کر کے میں ادھ موا سا ہو گیا۔ وہ سارا کھانا تو نکل گیا بلکہ اس سے پہلے کا کھایا بھی نکل گیا۔ اس کے بعد بھی دیر تک ابکائیاں آتی رہیں، یہ تصور ہی میرے لیے سوہان روح تھا کہ میں نے اپنے جیسے ایک انسان کا گوشت کھایا ہے۔ میں نے سارے برتن نیچے گرا دیے۔ میری طبیعت مکدر ہونے لگی، منہ کا ذائقہ بھی خراب ہو گیا تھا۔ نہ جانے کس انسان کا گوشت تھا ویسے انگلی، زنانہ ہاتھ کی لگتی تھی، اس صدمے نے میرا دماغ ماؤف کر دیا تھا، الٹیوں نے میری حالت اور زیادہ خراب کر دی اور میں بے دم سا ہو کر زمین پر گر پڑا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی چار سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پوری عمارت پر بھیانک سناٹا مسلط تھا، ایسے میں مجھے اپنے سانسوں کی آواز بھی یوں لگ رہی تھی جیسے میرے قریب خون خوار درندے کھڑے ہانپ رہے ہوں۔

ریشمی خطرہ

مسعود جاوید کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔ جرم و سزا اور جاسوسی و سراغرسانی پر ایک منفرد تحریر۔ ایک ذہین قابل اور خوبصورت خاتون (پرائیویٹ) سراغرساں کا دلچسپ قصہ، ایک مجرم اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ان کی ممکنہ شادی کی شرط بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک نہایت دلچسپ سنسنی خیز ناول۔ سراغرساں کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جاننے کے لیے پڑھیے...... **ریشمی خطرہ**...... جو کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

کافی دیر میں یونہی زمین پر پڑا ہانپتا رہا کہ دفعتاً "وہ پراسرار آواز پھر سنائی دینے لگی ،زوں ،زوں ،زوں اب اس آواز میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ حالانکہ اس پراسرار آواز نے بعد میں مجھے تھوڑی دیر ناقابل بیان اذیت سے دوچار کر دیا تھا ،لیکن پھر بھی میں اس آواز کا ممنون ہوں کہ اس نے مجھے تھوڑی دیر قبل کی اذیت ناک حالت اور ابکائیوں سے نجات دلا دی تھی ،کیونکہ اس عجیب آواز کو سن کر ہی میرا دھیان کچھ دیر پہلے کے کھانے اور انسانی گوشت سے ہٹ سکا تھا۔ اب میرے دماغ میں بس یہی آواز گھوم رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی یہ آواز کچھ اور تیز ہو گئی۔ لہذا میں زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے میں نے ایک سگریٹ سلگا لی۔ آواز کچھ اس طرح سے آرہی تھی کہ پورے کمرے میں گونجتی محسوس ہوتی تھی۔ لہذا میں نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کہیں کوئی بھنورا تو نہیں گھس آیا مگر کمرے میں ایک مکھی تک نظر نہ آئی۔

اب میں نے کان لگا کر ذرا غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ آواز باہر سے آرہی ہے۔ تجسس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس آواز کا پتہ چلاؤں۔ لہذا میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک آیا اور کنڈی کھول دی پھر دروازہ بھی کھول دیا...دروازہ چرچراہٹ کی ڈراؤنی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اس آواز نے رات کے سناٹے کو مجروح کر دیا تھا۔ میں کمرے سے باہر آیا تو اس پراسرار آواز میں کچھ اور اضافہ محسوس ہوا۔ میں نے غور سے سننے کی کوشش کی تو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ آواز بائیں طرف سے آرہی ہے۔ اس طرف باقی دو کمرے تھے۔ حالانکہ جس کمرے سے ابھی میں باہر نکلا تھا۔ اس کمرے کی روشنی کھلے ہوئے دروازے سے باہر تک پہنچ رہی تھی۔ مگر پھر بھی تیسرے اور چوتھے نمبر کے کمروں کے باہر کافی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکالی اور اسے روشن کر کے آگے بڑھنے لگا۔ جب تیسرے کمرے کے دروازے تک پہنچا تو یوں لگا کہ وہ عجیب و غریب آواز اس کمرے کے اندر سے آرہی ہو۔ جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اوپری منزل میں کل چار کمرے تھے اور یہ اس منزل کا تیسرا کمرہ تھا۔ آواز بے شک اس کمرے سے آرہی تھی ،مگر کمرے کے اندر مکمل تاریکی تھی۔ میں نے کواڑوں پر ذرا سا دباؤ ڈالا تو کواڑ کھل گئے۔ ویسے یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اس عمارت کا کوئی بھی کمرہ مقفل نہ تھا۔ جونہی دروازہ کھلا ،بدبو کا ایک کثیف جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا اور میں گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا اور ناک پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس بدبو سے پھر مجھے ابکائیاں آنے لگیں۔

میں سوچنے لگا کہ یہ کمرے نہ جانے کتنی مدت سے بند ہیں لہذا یہ کثیف ہوا خارج ہو تو میں پھر اندر جاؤں گا چند منٹ کے بعد میں نے پہلے ٹارچ کی روشنی اندر کمرے میں ڈالی ،پھر خود بھی اندر داخل ہو گیا۔

جس آواز کی تلاش میں میں اس کمرے میں آیا تھا ،وہ آواز کچھ اور بلند ہو گئی تھی ،لیکن میں اب بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ آواز کس چیز کی ہے اور کس طرف سے آرہی ہے۔ لیکن اس کمرے سے بدبو آرہی تھی ،نہ جانے کس چیز کی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں چاروں طرف گھمائی تو ایک بار پھر حیرت کا جھٹکا سا لگا ،کمرہ خالی تھا ،لیکن وہ آواز بلاشبہ اسی کمرے سے بلند ہو رہی تھی۔

یہاں بھی ایک میز ،ایک کرسی اور ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ الماری کے دونوں پٹ بند تھے اور ان میں ویسا ہی لکڑی نما تالا بھی لگا ہوا تھا۔ مگر میں نے اسے کھولنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کمرے میں ایک قدیم طرز کا آتشدان بھی تھا۔ جس کی کارنس پر سونے کا ویسا ہی نایاب شمع دان بھی رکھا ہوا تھا اور ہر چیز پر صدیوں کی گرد جمی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ کی دیوار میں شاہ بلوط کی لکڑی کا خوب صورت اور قدیم دروازہ تھا جو یقیناً چوتھے کمرے میں کھلتا تھا۔

شمع دان کو روشن کرتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اگر زندگی بچ گئی تو یہاں سے جاتے ہوئے یہ سارے شمع دان بھی اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ صرف یہ شمع دان ہی مجھے لکھ پتی بنانے کو کافی تھے ،اب تک میں نے جتنے کمرے بھی دیکھے تھے ہر ایک کمرے میں مجھے شمع دان نظر آیا تھا ،اس طرح مجھے یقین تھا کہ باقی کمروں میں بھی ایسے بیش قیمت شمع دان ضرور ہوں گے۔

یہ کمرہ اب مکمل روشن تھا مگر یہاں بھی وہی ہولناک ویرانی تھی جو اس عمارت کے چپے چپے پر چھائی ہوئی تھی۔ پوری عمارت پر جگہ جگہ

پراسرار، ماورائی اور مافوق الفطرت قوتوں کی حکمرانی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ آبادی کے اتنے قریب یہ جادونگری موجود تھی لیکن آبادی والے اس کے وجود سے بالکل بے خبر تھے۔ جب کہ یہاں اتنی بیش قیمت چیزیں بھی موجود تھیں۔ یہ سچ ہے کہ میں اس محلے سے ڈھائی میل دور، دوسرے محلے میں رہتا تھا لیکن پھر بھی آخر کو یہ میرا شہر تھا، لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا۔ میں نے کبھی کسی سے ایسی خوفناک عمارت کا تذکرہ پہلے نہیں سنا تھا... یہ اور بات ہے کہ میرا یہاں اس طرف آنا بہت ہی کم ہوتا تھا، لیکن پھر بھی ایک دو بار پہلے بھی میں اس محلے میں چوری کرنے آ چکا تھا، مگر اس عمارت کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔

☆☆☆

اک دیا جلائے رکھنا

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ شہرہ آفاق ناول اک دیا جلائے رکھنا بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے **رومانی معاشرتی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے "حال" سے غیر مطمئن ہونے اور "شکر" کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔



عجیب بات تھی کہ جس آواز کی تلاش میں، میں یہاں آیا تھا۔ وہ اسی کمرے سے اٹھتی محسوس ہو رہی تھی، مگر یہ کمرہ ایسی کسی چیز کی نفی کر رہا تھا۔ جس سے آواز آنے کی توقع ہو۔ ادھر بدبو نے بھی پریشان کیا ہوا تھا۔ آواز اب براہ راست میرے دماغ کو متاثر کر رہی تھی، مگر اس کے منبع کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اب مجھے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میرا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔ مجھے اپنے چاروں طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آ رہا تھا۔ آخر کار میں نے اپنی پوری توجہ آواز کی طرف کر دی تو ایسا لگا کہ آواز اس دروازے کی طرف سے آ رہی ہے جو چوتھے کمرے میں کھلتا تھا۔ میں دروازے کے قریب گیا اور غور سے سننے لگا۔ بلاشبہ آواز چوتھے کمرے سے ہی آ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ دروازہ کھولتے ہوئے مجھے ڈر سا لگ رہا تھا لیکن پھر تجسس خوف پر غالب آیا تو میں نے دروازے کو اندر دھکیلا، دروازہ چرچراہٹ کی آواز سے کھلا۔ اندر سخت تاریکی تھی لیکن دروازہ کھلتے ہی بدبو کا ایک تیز اور ناقابل برداشت جھونکا ناک سے ٹکرایا اور میں گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ مجھے پھر ابکائیاں سی آنے لگیں۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ بدبو مسلسل آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی جانور کی سڑی ہوئی لاش سے تعفن اٹھ رہا ہے۔ آواز اب اور زیادہ بڑھ گئی اور صاف طور پر مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرف لگ رہی تھی۔

تعفن اتنا شدید تھا کہ ایک منٹ وہاں رکنا بھی محال تھا لہٰذا میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا، مگر میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ تعفن اور آواز کہاں سے اٹھ رہی ہے۔ لہٰذا میں نے خود پر جبر کر کے ٹارچ روشن کی اور آگے بڑھ کر اس کی روشنی چوتھے کمرے میں ڈالی، مگر روشنی ڈالتے ایک تیز چیخ میرے منہ سے نکلی اور بے اختیار میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اندر ایک لاش تھی ہاں ایک عورت کی لاش، کمرے کے وسط میں ایک رسی کے ذریعے چھت سے لٹک رہی تھی۔ رسی کا پھندا عورت کے گلے میں پڑا ہوا تھا لیکن لاش سر سے پاؤں تک سیاہ نظر آ رہی تھی۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مکھیاں اس کی لاش سے چمٹی ہوئی تھیں۔ تبھی اس کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر جب روشنی محسوس کر کے مکھیاں اس کے چہرے سے اڑیں تو ایک بار پھر میری چیخ نکل گئی، عورت کی آنکھیں بھیانک انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور گالوں کا گوشت مکھیاں کھا چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے لاش کی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی اور اذیت کے ایسے بھیانک تاثرات تھے کہ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے گالوں سے ظاہر ہونے والی ہڈیوں نے اس کے چہرے کو اور خوفناک بنا دیا تھا۔ یہ منظر اتنا ہیبتناک تھا کہ میں بے اختیار چیخیں مارتا ہوا باہر بھاگا۔

اس وقت جیسے دل قابو میں نہ تھا اور میرے حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ جب میں بے اختیار بھاگتا ہوا زینے تک پہنچا تو جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، ہوش ایک لمحے کو رخصت ہو گئے اور دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

زینے کی درمیانی سیڑھیوں پر وہی خونخوار سیاہ بلا کھڑا میری طرف قہر بار نظروں سے دیکھ رہا تھا اس کا رخ میری جانب تھا اور اس کی سفاک آنکھوں سے غصے سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔۔۔ اچانک بلے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور میرے ہوش و حواس پر بجلی سی گر پڑی۔ میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں انسانوں کو مسکراتے دیکھا تھا۔ لیکن کسی خونخوار جانور کو مسکراتے ہوئے آج پہلی بار دیکھا تھا، یقین جانیے، اس بلے کی مسکراہٹ اتنی حیرت انگیز، خوفناک اور پراسرار تھی کہ میری سانس رکنے لگی اور دماغ جیسے بھک سے اڑ گئے۔ میں پتھر کے بت کی طرح اسے گھورے جا رہا تھا۔

میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بے کار ہو چکی تھیں یوں لگتا تھا جیسے مجھے وہاں کھڑے کھڑے صدیاں گزر گئی ہوں۔ مجھ سے ہلنے جلنے کی

طاقت بھی نہ تھی اور میرے جسم سے جیسے دم نکلا جا رہا تھا۔ دفعتاً بلا خوفناک غراہٹ سے میری طرف لپکا تو مجھے ہوش آ گیا اور میں واپس کمرے کی طرف بھاگا۔ ادھر بلے نے چھلانگ لگائی۔ ادھر میں دوسرے نمبر کمرے میں داخل ہوا، خونخوار بلے کا پنجہ میری ٹانگ پر پڑا مگر میں دروازہ بند کر چکا تھا ، پھر بھی بلا میرے پائنچے کا ٹکڑا لے اڑا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ صرف آدھ انچ کی کسر رہ گئی اور یہ خطرناک سیاہ بلا میرا فقط پائنچہ ہی ادھیڑ سکا۔ جب تک وہ دوسرا حملہ کرتا میں دروازہ بند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

میرا پورا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ پسینہ پانی کی طرح چوٹی سے ایڑی کی طرح بہہ رہا تھا اور میری سانس پھولی ہوئی تھی ، میرا رخ ابھی تک دروازے کی طرف تھا اور میں دونوں ہاتھ بند دروازے پر رکھے ہانپ رہا تھا۔ خدا کی پناہ، اس موذی سے خدا نے مجھے بال بال بچایا تھا۔ میں دوسرے نمبر کمرے میں اس وقت کھڑا تھا جہاں میں نے کھانا کھایا تھا۔

اسی وقت دروازے پر خوفناک بلے کی غراہٹیں سنائی دیں، وہ دروازے پر اپنے پنجے مار رہا تھا، تاکہ جلد سے جلد میرا خون پی سکے۔ میرا رخ ابھی تک دروازے کی طرف ہی تھا۔ لیکن بلے کی غراہٹیں سن کر، میں کمرے کی طرف مڑا، تاکہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر سکوں۔ کیونکہ دروازے پر اس کے پنجے نہایت تیزی سے پڑ رہے تھے۔ دروازہ حالانکہ بے حد مضبوط تھا لیکن بے حد پرانا بھی تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اگر اس کے پنجے اسی رفتار سے پڑتے رہے تو وہ جلد ہی دروازے کو گرا لے گا۔ لیکن جونہی میں کمرے کی طرف مڑا، میرا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر رہ گیا ، مجھ سے فقط پانچ چھ قدم کے فاصلے پر وہی سر کٹی عورت کھڑی تھی، جسے میں پہلے کمرے میں مسہری پر لیٹے دیکھ چکا تھا اور جس کی کٹی ہوئی گردن سے خون بہہ رہا تھا... اس وقت اس کے دائیں ہاتھ میں، اس کا اپنا ہی کٹا ہوا سر تھا جسے اس نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ سیاہ میلے سے لباس میں ملبوس تھی اور اس کی کٹی ہوئی گردن کے باقی بال ادھر ادھر لہرا رہے تھے، اس کے سر سے اور گردن سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ لیکن حیرت بات یہ تھی کہ اس کے کٹے ہوئے سر کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر ان آنکھوں میں وہ گول کالی ٹکیا نظر نہیں آ رہی تھیں۔ جو ہر انسان کی آنکھوں میں ہوتی ہے ، پھر بھی اس کی آنکھیں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس کے آگے کے دو دانت کافی لمبے تھے اور منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے، جن پر خون لگا ہوا تھا۔ جیسے وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آئی ہو۔ یہ منظر اتنا غیر فطری، بھیانک ڈراؤنا اور خوفناک تھا کہ میرا دل دھڑکنا بھول گیا جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ سانسیں جیسے رک سی گئیں اور خوف سے میری گھگی بندھ گئی۔ میں نے چیخنا چاہا لیکن میری آواز ہی نہ نکلی، میں نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر قدموں میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔ میں ایک پتھر کے بے جان بت میں تبدیل ہو چکا تھا اور جسم سے جیسے کسی نے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا تھا۔ مارے خوف کے میری آنکھیں حلقوں سے نکلی پڑ رہی تھیں۔

یہ تو سمجھنے میں آنے والی بات ہی نہ تھی کہ آدمی سر کٹنے کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ ایسا دل ہلا دینے والا منظر دیکھ کر میں زندہ کیسے بچ گیا۔ دہشت سے میرا ہارٹ فیل کیوں نہ ہو گیا۔

اچانک اس زندہ لاش کے کٹے ہوئے سر سے ایک دہشت ناک قہقہہ بلند ہوا اور میں جیسے ہوش میں آ گیا مگر میرے حواس ابھی تک گم تھے ۔ ادھر دروازے کے باہر وہ خونخوار بلا اپنے ناخنوں اور پنجوں سے مسلسل دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور آگے سر کٹی لاش جو یقیناً کوئی بدروح تھی، میرے سامنے موت بن کر کھڑی تھی۔ اس کے سر کے حلق سے اب مسلسل قہقہے بلند ہو رہے تھے اور میرا رہا سہا خون بھی خشک ہو رہا تھا، میرے آگے اور پیچھے موت تھی جو اپنے بھیانک جبڑے کھولے۔ دونوں طرف سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔

دفعتاً وہ سر کٹی لاش، آہستہ آہستہ میری جانب بڑھنے لگی، اور میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تاکہ فرار کی کوئی راہ تلاش کر سکوں۔ مگر وہاں ایک تو وہی پچھلی سمت کی کھڑکی تھی اور دوسرے میرے دائیں ہاتھ وہ دروازہ تھا جو تیسرے کمرے میں کھلتا تھا۔ کھڑکی کی راہ تو میرے لیے یوں مسدود ہو گئی تھی کہ اس کے آگے وہی سر کٹی شیطانی روح کھڑی تھی اور دائیں ہاتھ والے دروازے کا تصور ہی مجھے لرزہ براندام کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کیونکہ تیسرے کمرے سے متصل چوتھے کمرے میں وہ چھت سے لٹکی ہوئی لاش اور اس سے چمٹی ہوئی وہ

ہزاروں خونخوار اور آدم خور مکھیاں موجود تھیں، ادھر سر کٹی لاش میری طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے سر سے بلند ہونے والے قہقہے میرے سر پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہے تھے۔ میری مدافعت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ کیونکہ پے در پے واقعات نے میری حالت بہت بری کر دی تھی۔ اس وقت موت نے جس طرح مجھے دو طرف سے گھیر رکھا تھا وہ کچھ میرا دل ہی جانتا ہے۔ اس کا اندازہ فقط وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود اس قسم کے حالات میں کبھی گھرے ہوں۔ لہٰذا اس خوفناک اور جان لیوا صورت حال کا اندازہ میں کر سکتا تھا کہ اب میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس دہشت ناک صورت حال کا مقابلہ زیادہ دیر نہ کر سکا۔ لہٰذا میں ہزیانی انداز میں چیخنے لگا رک جاؤ، رک جاؤ میرے قریب مت آنا ورنہ، ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔ قتل کر دوں گا تجھے، رک جاؤ بچاؤ بچاؤ مجھے بچاؤ ارے کوئی ہے۔ مجھے بچاؤ بچاؤ۔''

یہاں تک پہنچ کر رشید رک گیا۔ شدت جذبات سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ میں اور ڈاکٹر امان اللہ حیرت زدہ ہو کر رشید کی حیرت ناک آپ بیتی سن رہے تھے۔ میں آس پاس کے ماحول سے بے خبر ہو کر، رشید کی عبرت ناک کہانی میں گم ہو چکا تھا۔ رشید کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور اس کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی تھی، جیسے وہی خوفناک منظر، اس وقت بھی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ رشید کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ اس نے پانی مانگا جو ڈاکٹر امان نے اسے منگا کر دے دیا۔ دو تین گلاس پانی پی کر اس کی حالت اعتدال پر آئی وہ چند منٹ خاموش رہا اور پھر اپنی داستان دوبارہ شروع کر دی۔

''ہاں تو صاحب! میں اس وقت بری طرح چیخ رہا تھا۔ مگر وہ خون آشام چڑیل، برابر میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس خوفناک بلا کو یوں اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر میں اچھل کر پیچھے ہٹا۔ اچھلتے وقت اچانک کوٹ کی جیب میں پڑی ہوئی کوئی بھاری چیز میرے ہاتھ سے ٹکرائی۔ تب مجھے یاد آیا کہ میرے پاس پستول بھی ہے۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے کوٹ کی جیب سے پستول نکالا اور یکے بعد دیگرے اس سر کٹی بد روح پر تین فائر کیے، لیکن اس وقت میں نے یہ عبرت ناک منظر دیکھا کہ تینوں گولیاں اسے لگیں۔ اس کے جسم میں سوراخ بھی ہوئے لیکن ان سوراخوں سے خون کا ایک قطرہ تک نہ نکلا اور وہ برابر آگے بڑھتی رہی، البتہ اس کے قہقہوں میں اب اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گولیاں میں نے کسی اور پر چلائی ہوں۔ اس پر گولیوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ یہ ناقابل یقین منظر دیکھ کر خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ اس وقت میرا سارا وجود طوفان کی زد میں آئے ہوئے درخت کی طرح لرز رہا تھا۔ اس وقت مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو پستول جیب میں رکھ کر میں تیزی سے آگے بڑھا اور اپنے قریب کی کرسی اٹھائی اور پوری قوت سے اس زندہ لاش پر دے ماری۔ وہ بھاری کرسی سمیت الٹ کر پچھلی سمت جا گری اور اس کے شیطانی قہقہے یکا یک اس طرح رک گئے۔ جیسے چلتے چلتے اچانک گراموفون ریکارڈ ختم ہو جائے۔

محبتوں کے ہی درمیاں

خواتین کی مقبول مصنفہ **نگہت عبداللہ** کے خوبصورت ناولٹوں کا مجموعہ، **محبتوں کے ہی درمیاں** جلد کتاب گھر پر آ رہا ہے۔ اس مجموعہ میں اسکے چار ناولٹ (تمہارے لیے تمہاری وہ، جلاتے چلو چراغ، ایسی بھی قربتیں رہیں اور محبتوں کے ہی درمیاں) شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کتاب گھر پر **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جونہی وہ گری میں دائیں طرف والے دروازے کی طرف بھاگا اور اسے کھول کر تیسرے کمرے میں آ گیا اور جلدی سے اسے بند کر دیا اور پھر تیسرے کمرے کے باہر والے دروازے کی طرف بھاگا اور اسے بھی اندر سے بند کر کے کنڈی چڑھا دی تاکہ وہ آدم خور بلا اندر نہ آنے پائے۔

فوری طور پر تو میں نے خود کو ان بلاؤں سے بچا لیا تھا لیکن آخر کب تک۔ جلد یا بدیر وہ مجھے پھر پکڑ لیں گی۔ ظاہر ہے ان بدروحوں کے لیے بند دروازے کیا اہمیت رکھتے تھے اب اس سر کٹی لاش کی طرف ہی غور کیجیے، میں نے اسے پہلے کمرے میں بستر پر لیٹے ہوا پایا تھا۔ مگر نہ جانے کس طرح وہ بلا دوسرے کمرے میں آ گئی تھی۔

یہ کمرہ میں پہلے ہی روشن کر چکا تھا۔ یہ تیسرا کمرہ تھا اور وہ دروازہ ابھی تک اسی طرح کھلا ہوا تھا جو چوتھے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہ ناقابل برداشت تعفن اسی طرح اسی رسی سے لٹکی ہوئی لاش سے اٹھ رہا تھا۔ مگر مجھ میں وہ دروازہ بند کرنے کا بھی حوصلہ نہ رہا تھا۔ میرا دماغ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ چاروں طرف موت اپنے پنجے تیز کر رہی تھی۔ باہر وہ میرے خون کا پیاسا قد آور بلا موجود تھا، برابر کے دوسرے کمرے میں وہ سر کٹی شیطانی روح، میرا خون پینے کو بے چین تھی، چوتھے کمرے میں وہ چھت سے لٹکی ہوئی گھورتی لاش اور آدم خور کھیاں۔ پیچھے وہ خوفناک سانپ جو یقیناً مجھے جکڑنے کے لیے بے قرار ہوگا۔ اس بھیانک عمارت کی ایک ایک چیز میری دشمن تھی، چاروں طرف سے موت مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے تھی، اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے سیاہ دیواروں کا ایک ایک پتھر مجھے گھور رہا ہو تاکہ مجھے جکڑ سکے۔

یہاں تھوڑی دیر کے لیے میری زندگی محفوظ ہو گئی تھی لیکن اس بدبو اور تعفن نے میرا دماغ الٹ کر رکھ دیا تھا، اب میرے اعصاب آہستہ آہستہ میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے، ادھر بھوک پیاس، بھاگ دوڑ اور خوف اور دہشت نے میری جان تک نکال دی تھی، لیکن اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اس تعفن کا تھا، جس سے میں کسی طرح بھی نجات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت میں بے بسی کی انتہا پر تھا۔ موت کی دعائیں مانگ رہا تھا مگر اس وقت موت بھی مجھ سے دور بھاگ رہی تھی۔ اس سر کٹی لاش کے ہاتھوں یا اس خونخوار بلے کے ہاتھوں، اذیت کی موت مجھے پسند نہیں تھی۔ ادھر زندگی بھی کوسوں دور تھی، عجیب بے کسی کا عالم تھا نہ میں جی رہا تھا، نہ مر رہا تھا۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ اس دماغ پاش بدبو سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لاش کو کس نے یہاں لٹکایا ہے۔ یہ عورت کون ہے۔ اتنا تو پتہ چل رہا تھا کہ اس عورت کو پھانسی دی گئی ہے، مگر کیوں۔ کیا یہ عورت بھی میری طرح نادانستگی میں اس عمارت میں داخل ہوئی تھی یا اس نے خودکشی کی ہے۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس منحوس عمارت کی ہر بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

مجھے تعجب تھا کہ اس شیطانی مکان میں اتنی وارداتیں ہو چکی ہیں، لیکن قریب کی آبادی اس سے لاعلم ہے آخر اس مکان پر دوسرے لوگوں نے دھیان کیوں نہیں دیا۔ کیا اس عمارت میں میرے سوا کبھی کوئی داخل نہیں ہوا لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں جو اتنا چیختا چلاتا رہا ہوں مگر کسی نے اب تک میری امداد نہیں کی، کیوں۔ کیا میری چیخیں باہر کسی نے نہیں سنیں۔ اگر یہاں کی آوازیں لوگوں نے سنی ہوتیں تو وہ دریافت حال کے لیے ضرور آتے، جب یہاں بہت سی شیطانی چیخیں اور قہقہے بھی گونجتے رہے اور یہ ساری آوازیں جس تیزی سے بلند ہوئی تھیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ رات کی تاریکی میں بہت دور دور تک سنی جا سکتی تھیں لیکن یہاں کوئی نہیں آیا تھا اس کا صاف مطلب تھا کہ یہاں کی آوازیں باہر نہیں سنی گئیں یہ امر نہایت تعجب خیز تھا، جب کہ قریب ترین آبادی صرف بیس قدم کے فاصلے پر ہے۔ اب یہ امیدیں بھی دم توڑنے لگیں کہ باہر سے کوئی میری مدد کو آئے گا۔

لیکن یہ بات حلق سے نیچے نہیں اتر رہی کہ لوگ اتنے قریب ہو کر آوازیں نہیں سن رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس عمارت کو کوئی آواز باہر جاتی ہی نہ ہو۔ یقیناً یہی بات ہے اور یہ بھی کوئی آسیبی چکر ہے۔ میرا دل بیٹھنے لگا اور زندہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی... میں حالات کے آگے بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اگر کوئی انسان ہوتا تو میں مقابلہ کر بھی سکتا تھا، لیکن مافوق الفطرت ہستیوں سے مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں

اپنے پستول کو بے اثر ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، بھلا ان شیطانی قوتوں سے ٹکرانا مجھ جیسے عام آدمی کی بات کہاں تھی، اور پھر حقیقت یہ بھی کہ اب نہ مجھ میں ہمت تھی، نہ حوصلہ کہ میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کر سکتا۔ میں ان بلاؤں میں مکمل طور پر گرفتار ہو چکا تھا۔ ایک بار تو جی میں آیا کہ پچھلی سمت کی کھڑکی کھول کر نیچے چھلانگ لگا دوں۔ چاہے ہاتھ پیر ہی کیوں نہ ٹوٹ جائیں۔ مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے میں کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔

اتنا میں جانتا تھا کہ پچیس تیس فٹ نیچے کودنا اور پھر ہاتھ پیروں کا سلامت رہ جانا بے حد مشکل ہے۔ اگر میں ایسا کرتا تو پھر ساری عمر معذوری کی زندگی بسر کرنا پڑتی اور پھر یہ بھی ممکن تھا کہ نیچے کودنے اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کے بعد اگر وہ آدم خور بلا یا سانپ یا وہ سرکٹی عورت مجھے پکڑ سکتی تو نہ میں بھاگ سکتا نہ ہی مقابلہ کرنا میرے بس میں ہوتا لہٰذا میں نیچے کودنے کی ہمت نہ کر سکا۔

میری حالت ابھی تک خراب تھی، دل دھڑک رہا تھا، دماغ سنسنا رہا تھا اور بدن کانپ رہا تھا میری حالت اس وقت اس چوہے جیسی تھی جس کے چاروں طرف خون خوار بلیاں کھڑی غرا رہی ہوں۔ اس آسیب زدہ عمارت میں میرا ایک ایک پل کانٹوں پر بسر ہو رہا تھا اور مجھے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ ہر آن یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں شیطانی روح اور وہ خونخوار بلا یہاں بھی نہ آ پہنچیں۔ ادھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ ابھی تک جسم میں سنسنی پیدا کر رہی تھی، کیونکہ وہ آدم خور مکھیاں اگر مجھ سے آ چمٹیں تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان سے نجات نہیں دلا سکتی تھی۔ ادھر بدبو نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا، میرے چاروں طرف موت ہی موت تھی جب کہ زندگی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

مصیبت کے ایسے لمحات میں ہر انسان کو خدا ہی یاد آتا ہے۔ خود غرض انسان کو جب کوئی فکر نہیں ہوتی تو وہ بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتا مگر جب اس پر برا وقت آتا ہے اور وہ مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر اسے کڑے وقت میں خدا ہی یاد آتا ہے۔ یہی حال اس وقت میرا بھی تھا۔ ایسے ہولناک حالات میں پھنس کر جب میں زندگی سے مایوس ہو گیا تو بے اختیار مجھے خدا یاد آیا۔ لہٰذا میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے پناہ مانگنے لگا کہ مجھے ان شیطانوں سے بچائے اور اپنی امان میں رکھے۔ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میری وحشت میں کچھ کمی آ گئی۔ بے شک یہ اسی کا نام ہے جو دلوں کو سکون دیتا ہے۔ میرے دل سے دہشت بھی کچھ کم ہو گئی اور میں از سر نو اپنی جان بچانے کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔ مگر میرا دماغ صحیح طور پر اب کچھ سوچنے کے قابل نہ تھا اس لیے جان بچانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

معاً ایک اور خیال میرے دماغ میں آیا کہ اگر میں پچھلی کھڑکی کھول کر مدد کے لیے چلانا شروع کر دوں تو ہو سکتا ہے کہ باہر کچھ لوگ میری مدد کو آ جائیں، لیکن پھر خیال آیا کہ میں اتنا چیخا، چلاتا رہا ہوں مگر کوئی نہیں آیا لیکن دل نے یہ استدلال دیا کہ وہ ساری آوازیں عمارت کے اندر بلند ہوتی رہی ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ آوازیں لوگوں تک نہ پہنچی ہوں اب مجھے کھڑکی سے منہ نکال کر لوگوں کی آوازیں ضرور دینی چاہئیں شاید کوئی سن لے۔ چنانچہ میں کھڑکی تک آیا اور اسے کھول کر مکانوں کی طرف نظر دوڑائی، کچھ فاصلے پر مکان موجود تھے کچھ مکانوں میں روشنی بھی ہو رہی تھی۔ اسٹریٹ لائٹ بھی تھی مگر ان کی روشنی زیادہ نہ تھی۔ اپنے اتنے قریب مکانات دیکھ کر دل کو کافی تقویت سی ہوئی۔ پھر میں نے اللہ کا نام لے کر آوازیں دینی شروع کیں۔ بچاؤ، بچاؤ، ارے کوئی ہے، مجھے بچاؤ خدا کے لیے مجھے ان بلاؤں سے بچاؤ... میری تیز چیخیں رات کے بے کراں سناٹے میں دور دور تک گونجتی رہیں، مجھے یقین ہے کہ میری آوازیں رات کی خاموشی میں کم از کم دو ڈھائی سو قدموں تک ضرور پہنچ رہی ہوں گی۔ لیکن اس وقت میری حیرت اور خوف کی حد نہ رہی جب چیخ چیخ کر میرا گلا سوکھ گیا مگر کوئی میری مدد کو نہ آیا جب کہ قریب ترین مکان فقط بیس قدم کے فاصلے پر تھا یہ سید علی جان شاہ کا مکان تھا، اس کے مکان میں لگا ہوا علم جس میں رنگین قمقمے لگے ہوئے تھے، میرے سامنے تھا، اس کے بعد دوسرے مکانات دور دور تک پھیلتے چلے گئے تھے بہت دور مشہور و معروف بادشاہی مسجد کے بلند میناروں کے قریب یادگار پاکستان بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا لیکن نہ لوگوں کے دروازے کھلے نہ ہی چوکیدار آیا۔

اب میں بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنے قریب سے لوگ میری آواز نہ سن سکیں۔ ایسی بات بھی نہ تھی کہ لوگ میری

آوازیں سن کر بھی باہر نہ آتے، کیونکہ مجھے یاد تھا کہ چوکیدار کی آوازیں سن کر بہت سے لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے تھے بلکہ سب نے میرا تعاقب بھی کیا تھا میں نے اپنا سر تھام لیا۔ اب اس بات میں شک وشبے کی گنجائش ہی نہ تھی کہ میری آواز وہاں تک پہنچ ہی نہیں رہی ہے۔

یا اللہ اب میں کیا کروں کہاں جاؤں۔ میں نے خود کو اتنا بے دست و پا کبھی محسوس نہیں کیا تھا، جتنا اس وقت کر رہا تھا، بے بسی کے شدید احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں بے دم ہو کر ایک کرسی پر گر گیا، اب میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

ادھر شدید بدبو نے میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا تھا آہستہ آہستہ میرے ہوش وحواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے... اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور میں اچھل کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں اس منحوس مکان میں داخل ہوا تھا اور اندر پہنچ کر میں نے دیکھا تھا کہ دو زینے مجھے نظر آئے تھے ایک دائیں جانب تھا اور ایک بائیں جانب، میں بائیں طرف والے زینے سے چڑھ کر اوپر آیا تو پہلے کمرے تک پہنچا تھا، اس کا مطلب ہے کہ دائیں طرف زینہ، چوتھے کمرے تک پہنچتا ہو گا لیکن مشکل یہ تھی کہ چوتھے کمرے میں وہ بھیانک لاش چھت سے لٹکی ہوئی تھی جس پر ہزاروں، لاکھوں آدم خور مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں، جن کی بھنبھناہٹ کی خوفناک آواز اعصاب کو ابھی تک جھنجھوڑ رہی تھی۔

مجھ پر اس کمرے میں جانے کے تصور سے ہی کپکپاہٹ طاری ہو رہی تھی، پھر یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ اگر میں نیچے پہنچ بھی گیا تو وہ سانپ مجھے ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا اور پھر کیا پتہ وہ بلا بھی نیچے ہو۔ پھر یہ خیال آیا کہ سانپ تو کمرے میں بند تھا لیکن وہ بلا بھی تو کمرے میں بند تھا، پھر وہ کیسے باہر آ گیا۔ جب کہ بلے کی بہ نسبت سانپ آسانی سے باہر آ سکتا ہے۔

لیکن مرتا کیا نہ کرتا، بالآخر میں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ جس دوہرے تہرے عذاب میں، میں یہاں گرفتار تھا کم از کم مجھے اس سے تو نجات ملے گی، پھر اگر زندگی نہ سہی، موت ہی سہی، کم از کم اس جان لیوا صورت حال اور دماغ پاش بدبو سے تو جان چھوٹے گی۔ یہ سوچتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب چاہے موت بھی کیوں نہ آئے۔ لیکن رہائی کی آخری کوشش ضرور کروں گا۔

یہی سوچ کر میں اس کھلے ہوئے دروازے کے قریب آیا جو چوتھے کمرے میں جاتا تھا، وہاں کھڑے ہو کر ٹارچ جیب سے نکالی اور روشن کر کے اس کا رخ اس کونے کی طرف کیا جہاں میرے اندازے کے مطابق دروازہ ہونا چاہیے تھا، ٹارچ کی روشنی لمبی لکیر اس طرف پڑی تو یہ دیکھ کر دل کو تسلی ہوئی کہ دروازہ واقعی موجود ہے۔ میں نے ایک ہاتھ ناک پر رکھا اور بھاگتا ہوا چوتھے کمرے میں داخل ہو گیا اور لٹکی ہوئی لاش سے بچتے ہوئے تیزی سے اس دروازے تک پہنچا اور اسے کھول کر باہر نکلا تو خوشی سے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا سامنے ہی لکڑی کا زینہ نظر آ رہا تھا، میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں وہ بلا یا سر کٹی لاش قریب نہ ہو۔ مگر کوئی نہ تھا، لہذا میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر زینے پر پیر رکھتا ہوا نیچے اترنے لگا، زینہ چونکہ شکستہ تھا۔ اس لیے بری طرح ہچکولے کھانے لگا۔ ہر قدم پر اس میں سے عجیب عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں زینہ ٹوٹ کر نیچے ہی نہ گر پڑے، یا اس کے ہلنے سے کہیں میں ہی نیچے نہ گر پڑوں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا اور آخر کار میں نیچے پہنچ ہی گیا۔

جلتی ہوئی ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی، لیکن نیچے پہنچ کر جونہی میں نے ٹارچ کی روشنی راہداری کی طرف ڈالی، مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ راہداری کے درمیان میں وہی سیاہ ناگ زمین سے تین فٹ اوپر اپنا خوفناک پھن اٹھائے جھوم رہا تھا۔ جس بات کا مجھے ڈر تھا، آخر وہی بات ہوئی۔ وہ بار بار اپنی زبان جو چراغ کے قریب لمبی تھی، باہر نکال رہا تھا میرے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے اور جسم جیسے پتھر کا ہو گیا، اس خوفناک عفریت کو باہر جانے والے واحد راستے پر موجود دیکھ کر میری رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ اس وقت خون کا دباؤ جیسے میری کنپٹیاں پھاڑنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی قوت تھی کہ میرا ذہن جیسے اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ موت کو اتنے قریب پا کر میری ہر حس بیدار ہو چکی تھی۔ جسم کے سارے مساموں نے پسینہ اگل دیا تھا۔ میرے حواس جواب دینے لگے تھے کہ اسی وقت فضا میں ایک ہیبت ناک قہقہہ گونجا اور مکان کے در و دیوار تھرا کر رہ گئے۔ آواز میرے پیچھے، زینہ کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے بے اختیار سر گھما کر زینے کی طرف دیکھا تو دہشت سے میرا سارا وجود لرز کر رہ گیا۔ زینے کے اوپر آخری سیڑھی پر، وہی عورت کی ہیبت ناک سر کٹی لاش کھڑی تھی۔ اس کا سر اس وقت بھی اس کے

ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور اس سر کٹی شیطانی لاش کے برابر ہی، وہ آدم خور خونخوار بلا کھڑا اپنی خوفناک آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا، اس کی آنکھیں دہکتے انگاروں کی مانند روشن تھیں، جن میں قہر و غضب کے کوندے لپک رہے تھے۔ میرے حلق سے کربناک چیخ نکلی اور میرے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ گئی میں نے ٹارچ اٹھائی تو میری نظر سامنے پڑی، مجھ سے صرف تین فٹ کے فاصلے پر وہی خطرناک سانپ تھا جو تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔

مجھے غافل پا کر نہ جانے کب وہ اپنی جگہ چھوڑ کر میری طرف بڑھا تھا... اگر میرے ہاتھ سے ٹارچ نہ گرتی تو وہ خوفناک سانپ بے خبری میں مجھے ڈس لیتا۔ اب موت مجھ سے فقط ایک فٹ کے فاصلے پر تھی کہ اسی لمحے پیچھے سے بلے کی خوفناک غراہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی عورت کے سر سے ہیبت ناک قہقہ گونجا اور میں نے سوچے سمجھے بغیر سانپ کے اوپر سے چھلانگ لگا دی اور راہداری میں بھاگنے لگا۔ راہداری عبور کرتے ہی سامنے دروازہ آ گیا جو ڈھانچے والے کمرے میں کھلتا تھا۔ دروازہ اندر آتے وقت میں نے کھولا تھا وہ اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں نہایت تیزی سے بھاگتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا جہاں ڈھانچہ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت موت کے خوف سے میرا دم سمٹ کر ٹانگوں میں آ گیا تھا۔ میرے پیچھے بلے کے غرانے اور عورت کے شیطانی قہقہوں کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں مگر میں نے کسی طرف دیکھا تک نہیں اور بھاگ کر اس کھڑکی تک پہنچا اور نہایت تیزی سے اسے کھول دیا جہاں سے گزر کر میں اس شیطانی عمارت میں داخل ہوا تھا۔ کھڑکی کھلتے ہی مجھے اپنے پیچھے اس ڈھانچے والے کمرے میں بہت نزدیک سے بلے کے غرانے کی آوازیں سنی مگر میں نے مڑ کر دیکھنے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا اور کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میرے منہ سے ہذیانی انداز میں چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ باہر گرتے ہی میں اٹھ کر قریب کے مکانوں کی طرف دوڑا اور جلد ہی سید علی جان شاہ کے مکان تک پہنچ گیا۔ ایک لمحے کے لیے رک کر میں نے اپنے پیچھے نگاہ ڈالی تو بے حد حیران ہوا کہ کوئی چیز میرا پیچھا نہیں کر رہی تھی۔ نہ وہ خونخوار بلا نہ خوفناک سانپ نہ سر کٹی عورت نہ ہی اب ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، مگر میں نہ رکا اور مسلسل بھاگتا رہا راستے میں کئی بار بھاگتے بھاگتے گرا بھی لیکن فوراً اٹھ کر بھاگنے لگتا۔ اس وقت مجھے اپنے جسم سے آگ سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

حالانکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ کوئی چیز میرا پیچھا نہیں کر رہی تھی پھر بھی مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ خوف ناک بلا، پر اسرار سر کٹی عورت اور وہ سیاہ ناگ برابر میرا پیچھا کر رہے ہوں۔

☆☆☆

سلگتے چہرے

ضوبار یہ ساحر کے جذبات نگار قلم سے ایک خوبصورت ناول...... اُن سُلگتے چہروں کی کہانی جن پر سجی آنکھوں میں انتظار کا عذاب لو دے رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستان حیات جسے اپنے خوابوں کو کچل کر میدان عمل میں آنا پڑا۔ اس کے نرل نگل جذبوں پر فرض کا ناگ پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ اس لئے محبت کو جانچنے پرکھنے کے فن سے وہ ناواقف تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود دل کے ویرانے میں کہیں ہلکی ہلکی آنچ دیتا محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ وہ جو سائے کی طرح قدم قدم اسکے ساتھ رہا اس پر بیتنے والی ہر اذیت کو اس نے بھوگا۔ وہ ادھوری لڑکی اُسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر وہ عکس کبھی پیکر بن کر اسکے سامنے نہیں آیا اور جب وہ سامنے آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی؟؟

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔



مجھے نہیں معلوم نہ جانے کن گلیوں اور راستوں سے گزر کر میں آخر کار اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا... دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیانی خلا میں ہاتھ ڈال کر میں نے اندرونی کنڈی کھولی... اس وقت بھی میری حالت یہ تھی کہ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی، آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ خوف سے جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا تھا۔ پورا جسم اور کپڑے پسینے سے تر تھے حواس گم تھے اور دل جیسے کھوپڑی میں دھڑک رہا تھا۔ اس وقت بھی مجھے یوں لگا جیسے بلے کے غرانے کی آواز کہیں قریب سے سنی ہو۔ لیکن اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو دروازے کا تیز کھٹکا سن کر میری ماں ہڑبڑا کر باہر نکل آئی تھی میری حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ماں کو اپنے سامنے دیکھ کر میری جان میں جان تو آئی، لیکن میں... جواب تک موت سے مقابلہ کرتا رہا تھا اور ایک ایک پل مر مر کے جیا تھا، ماں کو اپنے قریب پا کر ایک عزیز ترین ہستی کو اپنے قریب پا کر میری ہمت بالکل جواب دے گئی۔ ہاتھ پیروں میں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔ ماں کو دیکھ کر میں نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا ماں مجھے اس سے بچا لو ماں پھر مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ میرا ذہن جیسے تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور میں بے ہوش کر ماں کے قدموں میں گر پڑا میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔

پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر، میرے قریب بیٹھی ہوئی میری ماں، میرے لال کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی اور بے اختیار ہو کر چومنے اور رونے لگی... وہ کہہ رہی تھی کہ خدا کا شکر ہے کہ تم ہوش میں آ گئے ورنہ مجھے بڑی تشویش تھی۔ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے بیٹا۔ میں نے جواب دیا "ٹھیک ہوں ماں، لیکن ہم کہاں ہیں۔" ماں بولی "بیٹے تم اسپتال میں ہو، تمہیں آج تیسرے روز ہوش آیا ہے" یہ سن کر مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے امی سے پوچھا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اس پر ماں بولی کہ بیٹا مجھے کیا پتا یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا۔ تم شاید ڈر گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے کہ تم ڈر گئے ہو۔ اس رات تم گھر آئے تو صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ تم کسی سے بہت خوف زدہ تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے بچاؤ۔ تمہیں بہت بخار بھی تھا، پھر تم بے ہوش ہو گئے تھے، میں تمہیں پڑوسیوں کی مدد سے اسپتال لائی تھی۔ ماں اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ پہلے تو میں حیران ہوا، لیکن پھر آہستہ آہستہ اس رات کے حیرت ناک واقعات۔ ایک ایک کر کے یاد آ گئے اور میں ایک بار پھر چیختا ہوا بے ہوش ہو گیا۔

دوسرے دن ہوش آیا تو میرا دوست فقیر محمد جسے میں پیار سے فقیرا کہتا تھا، میرے قریب اسٹول پر بیٹھا تھا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر بولا۔ اب تم کیسے ہو۔ میں نے کہا میں ٹھیک ہوں کہنے لگا یار رشید مجھے حیرت ہے، ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ تم بے حد ڈر گئے ہو یار مجھے یقین نہیں آتا تم تو بہت دلیر اور بہادر ہو۔ تم پانچ، دس آدمیوں کو تو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ تم اور کسی سے ڈر جاؤ، یہ بات اپنے حلق سے نیچے نہیں اترتی یار، آخر یہاں لاہور میں کون ایسا مائی کا لال پیدا ہو گیا ہے جس نے تمہیں اتنا خوف زدہ کر دیا ہے کہ تم بار بار بے ہوش ہو رہے ہو جب کہ تمہارے جسم پر کسی چوٹ وغیرہ کا نشان بھی نہیں ہے۔ پھر آخر بات کیا ہے۔ یار کچھ تو بتاؤ۔ فقیرا میرا بہت گہرا دوست تھا اور اس کی جنرل اسٹور کی چھوٹی سی دکان تھی۔ گو وہ خود چوری چکاری سے دور رہتا تھا مگر میرے بارے میں جانتا تھا کہ میں یہ برا کام کرتا ہوں، لیکن اس کا کہنا تھا کہ یار کو یاری سے مطلب ہونا چاہیے۔ پھر بھی وہ مجھے سمجھاتا رہتا تھا۔ حالانکہ اب مجھے پہلے واقعات یاد آ چکے تھے۔ پھر مجھے ڈر تھا کہ میں پھر بے ہوش ہو جاؤں اس لیے میں نے فقیر محمد کو جواب دیا... یار فقیرا، میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔ بس ذرا ٹھیک ہو جاؤں۔ وہ بولا ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔

اس کے بعد میں ایک مہینہ ہاسپٹل میں رہا۔ اس دوران میں تین بار بے ہوش ہوا اور یہ حقیقت بھی تھی کیونکہ جب بھی مجھے وہ دہشت

ناک واقعات شدت سے یاد آتے میں چیختا ہوا بے ہوش ہو جاتا۔ فقیرا اس دوران ہر روز ہاسپٹل آتا رہا۔ آخر مسلسل ایک ماہ کے علاج کے بعد میں مکمل ٹھیک ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اس دوران میں نے اصل واقعات نہیں بتائے تھے۔ اس نے کئی بار پوچھا بھی مگر میں نے خواب میں ڈر جانے کا بہانہ کر دیا کیونکہ مجھے یقین تھا وہ میری بات کا اعتبار نہیں کرے۔ بلکہ الٹا وہ مجھے پاگل نہ سمجھنے لگے۔ کیونکہ بے ہوشی کے دوران میں اکثر بڑبڑاتا رہتا تھا۔ خیر صاحب۔ ایک مہینے بعد ٹھیک ہو کر گھر آ گیا۔ لیکن مجھے احساس تھا کہ میری اندرونی حالت کافی کمزور ہے۔

میں اور فقیر محمد پہلے بھی ملتے رہتے تھے اور بعد میں بھی ملتے رہے۔ ہاسپٹل سے آنے کے دوسرے دن فقیرا کے پوچھنے پر میں نے مختصراً سارے واقعات اسے بتا دیے۔ میری ساری بات سننے کے بعد وہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگا جیسے اسے میری دماغی حالت پر شبہ ہو۔ اس نے اس سلسلے میں مجھ سے دو تین سوالات بھی کیے، جن کے جوابات میں نے اسے دیے تھے۔ آخر میں وہ کہنے لگا۔ یار رشید ایک بات کہوں تم یقین کرو گے۔ میں بولا کیوں نہیں۔ بتاؤ کیا بات ہے۔ چند لمحات وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر بولا رشید! حقیقت یہ ہے کہ تم خواب میں ڈر گئے ہو۔ یہ سارے واقعات تم نے خواب میں دیکھے ہیں، حقیقت سے ان واقعات کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اب میں اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا تھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ میں بولا یار یہ ناممکن ہے تم یقین کرو یہ سارے واقعات سچے ہیں اور مجھ پر گزر چکے ہیں۔ میری بات سن کر وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ پھر بولا۔ پیارے میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ تم نے ایک بھیانک خواب دیکھا ہے اور کچھ نہیں۔ میں اس کی باتوں پر حیران ہو رہا تھا۔ میں بولا یار فقیرا تم مجھ پر یقین کیوں نہیں کرتے میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ ایک ایک لفظ حقیقت ہے، کیا میں پاگل ہوں کہ حقیقت اور خواب میں فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ وہ کہنے لگا اور اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ تم نے واقعی خواب دیکھا ہے تو کیا پھر تم میری بات مان لو گے۔ میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ بے وقوف ہے جو میری بات کو ایک خواب سمجھ رہا تھا یہ تو مجھے معلوم تھا کہ میں کس طرح مرتے مرتے بچا تھا۔ مجھے اب تک وہ چیتے کی مانند قد آور خونخوار سیاہ بلا اور بیس فٹ لمبا خوفناک سیاہ ناگ اور سب سے بڑھ کر وہ بھیانک مرکٹی لاش اچھی طرح یاد تھی۔ ان سے میں نے جان پر کھیل کر اپنی جان بچائی تھی۔ اس حیرت ناک، عجیب اور خطرناک واقع کو تو میں زندگی بھر بھلا نہیں سکتا تھا۔ ویسے ایک واقعے پر مجھے بھی حیرت تھی کہ اس خوفناک مکان کے باہر کسی نے میرا پیچھا نہیں کیا تھا۔ لیکن مجھ پر گزرا ہوا ایک ایک واقعہ بہرحال سو فیصدی سچا تھا۔ اس کا ثبوت میری ماں کا یہ بیان بھی تھا کہ اس رات جب میں گھر آیا تو حد سے زیادہ خوف زدہ تھا اور گھر پہنچتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر فقیرا خود اس بات کا شاہد تھا کہ اسپتال میں مجھ پر کیا گزری تھی، جہاں میں چار، پانچ بار بے ہوش ہو چکا تھا۔ کیا اتنا ڈر اور خوف صرف خواب کی وجہ سے تھا۔ جب کہ فقیرا کہہ رہا تھا کہ میں نے خواب دیکھا تھا اب بھلا کس طرح میں یہ یقین کرتا کہ وہ سب کچھ واقعی ایک خواب تھا۔ جب فقیرا کو میں نے اپنی ماں کے بیان کے بارے میں بتایا تو وہ بولا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ تم اس رات باہر کسی جگہ لیٹ گئے ہو گے، جہاں تم نے خواب دیکھا اور ڈر کر بھاگ نکلے اور گھر پہنچ گئے۔ اب ظاہر ہے کہ تمہاری ماں نے تو تمہیں خوفزدہ حالت میں ہی دیکھا ہو گا۔ ویسے میرے پیارے دوست، میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے کہ تم نے اس رات خواب دیکھا تھا اور کچھ نہیں، کیونکہ بعض خواب اس قسم کے ہوتے ہیں کہ بالکل ان پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ بس یہی ساری حقیقت ہے۔

فقیرا کی یہ بات سن کر میں ہنس دیا کہ واقعہ تو میرے ساتھ پیش آیا ہے، پھر بھلا اس کے پاس کوئی ثبوت کہاں سے آ گیا۔ آخر کار میں نے کہا۔ اچھا بتاؤ کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے۔

فقیرا کہنے لگا "تو سنو میرے پیارے دوست، دل تھام کر سنو تم نے ہی بتایا تھا کہ محلہ قاضی پور کے آخری حصے میں، سید علی جان شاہ کے مکان سے اندازاً بیس قدم کے فاصلے پر، مشرق کی طرف ایک مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی جہاں تم لوگوں کے ڈر سے اندر کود گئے تھے، جہاں تمہیں یہ سارے واقعات پیش آئے یہ کیوں۔ یہی کہا تھا نا تم نے"

میں نے جواب دیا" بالکل یہی بتایا تھا میں نے"

فقیرا بولا" تو سنو دوست، یہ بہت بڑا محلہ ہے میں اس محلے کی ایک ایک گلی، ایک ایک گھر سے واقف ہوں۔ اس محلہ کا آخری مکان، سید علی جان شاہ کا مکان ہے۔ یہ مکان جنوب کی طرف ہے۔ اس مکان میں ایک علم بھی لگا ہوا ہے جس میں بجلی کے رنگین قمقمے بھی لگے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ سن کر شاید تمہیں حیرت ہو کہ اس مکان کے مشرق کی طرف دور دور تک کوئی دوسرا مکان نہیں ہے۔ صرف مشرق ہی نہیں اس مکان کے شمال کی طرف بھی کوئی مکان نہیں ہے اور مکان کیا کہتے ہو......"

یہ سنتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا سا لگا اور میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، میں ہکا بکا کھڑا اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اس انکشاف سے مجھ پر بجلی سی گر پڑی تھی۔ میرا دماغ چکرا گیا اور جسم سن ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں یہ کسی طور ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ سب کچھ خواب تھا، جب کہ سارے واقعات میری آنکھوں کے سامنے آ چکے تھے اور مجھے ان پر اس قدر یقین تھا جتنا خود پر کہ میں اس وقت فقیرا کے سامنے زندہ سلامت موجود ہوں اگر کوئی کہتا کہ کل آسمان پر ایک کے بجائے چار سورج موجود تھے تو بھلا اس بات پر کون یقین کرتا۔ میرے لیے یہ بالکل ایسی ہی انہونی بات تھی۔ میں یہ بات کسی بھی قیمت پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ سارے واقعات فقط ایک خواب تھے۔

فقیرا میرے چہرے پر نظریں جمائے غور سے میرے تاثرات دیکھ رہا تھا، میرے چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے، بے ساختہ میرے منہ سے نکلا" یہ ناممکن ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا" فقیرا ایک قہقہہ مار کر ہنس دیا اور بولا۔ مجھے پہلے ہی یقین تھا میرے دوست کہ تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ کیونکہ کئی خواب اس قسم کے ہوتے ہیں کہ بالکل حقیقت کی طرح لگتے ہیں اور انسان کو یہ یقین بھی نہیں آتا کہ یہ کوئی خواب تھا اور پھر تمہاری یہ بات مان بھی لی جائے کہ تم نے خواب نہیں حقیقت دیکھی تھی تو تم ہی خود بتاؤ کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت جس کا سر ہی نہیں تھا وہ پھر بھی ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ اس بات کو میں تو کیا دنیا کا کوئی بھی ہوش مند انسان تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ گردن کٹ جانے کے بعد دنیا کا کوئی جاندار بھی زندہ نہیں رہ سکتا، یہ قدرت کا بنایا ہوا اصول ہے جسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔

میں ششدر سا کھڑا فقیرا کی بات سن رہا تھا۔ فقیرا کے اس انکشاف نے کہ وہاں سرے سے کوئی مکان ہی نہیں ہے۔ میری بنیادیں ہلا دی تھیں۔ کئی منٹ تک تو میرے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکل سکا۔ پھر جب میں بولا تو مجھے اپنی ہی آواز دور کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی یار فقیرا ایسا ہو سکتا ہے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو لیکن بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ یہ سارے انوکھے واقعات مجھے پیش آئے ہیں۔ سو واقعات معمولی نہیں تھے کہ میں اب تک کئی بار بے ہوش ہو چکا ہوں، ورنہ میں اتنا کمزور دل تو ہرگز نہیں تھا کہنے کو تو میں نے فقیرا سے یہ بات کہہ دی تھی تو کیا وہ واقعی سب کچھ ایک خواب تھا۔ میں نے سوچا لیکن میرا دل اسے خواب ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ میری آنکھیں اتنا بڑا دھوکہ نہیں کھا سکتی تھیں اگر چند لمحات کی بات ہوتی تو شاید میں یقین کر بھی لیتا کہ وہ خواب تھا لیکن لگا تار چھ طویل گھنٹے میں اس جاں سوز عذاب میں گرفتار رہا تھا۔ پھر میں اسے خواب کیسے مان لیتا۔ فقیرا بولا۔ رشید تم یقین کرو کہ تم نے فقط ایک خواب دیکھا تھا۔ لیکن تم اب بھی یقین نہیں کرتے تو آؤ میرے ساتھ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا پھر کچھ دور چلنے کے بعد اس نے ایک تانگہ رکوایا اور ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ پھر اس نے تانگہ والے سے قاضی پورہ محلہ چلنے کو کہا۔ تو میں فقیرا کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ حالانکہ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ پھر بھی قاضی پورہ کا نام سن کر میرے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں تھیں۔ یہ بات فقیرا نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ مجھے تسلی دینے لگا۔ یار رشید مرد ہو یہ کیا کہ تم دن کو بھی خوف کھا رہے ہو۔ ارے بھئی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔

تھوڑی دیر بعد ہی تانگہ قاضی پور پہنچ گیا۔ فقیرا ایک چالاک اور سمجھدار انسان تھا اور پھر میری موجودہ حالت سے بھی واقف تھا۔ اس لیے ہم تانگے سے نیچے نہیں اترے بلکہ اس نے تانگہ والے سے کہا بھائی۔ اس محلے کے آخری حصے کی طرف چلے چلو۔ وہ اس طرف، وہ اسے

اشارے سے راستہ بتانے لگا یہاں تک کہ سید علی جان شاہ کا مکان آ گیا۔ لیکن تانگہ آگے بڑھتا چلا گیا یہ دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی کہ سید علی جان شاہ کے مکان کے آگے کچھ نہ تھا۔

جس جگہ وہ پراسرار مکان اس رات میں نے دیکھا تھا۔ اس جگہ خالی قطعہ زمین میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ یہاں دور، دور تک کوئی مکان نہ تھا کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں ضرور کھڑی تھیں۔ میں نے اشارے سے فقیرا کو وہ جگہ دکھائی جہاں اس رات میں نے وہ پراسرار مکان دیکھا تھا۔ فقیرا مجھے دیکھ کر مسکرایا اور تانگہ والے سے واپس چلنے کو کہا۔

حیرت سے میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اب مجھے بھی شک ہونے لگا تھا کہ اس رات شاید واقعی کوئی ڈراؤنا خواب ہی میں نے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب یہاں کوئی عمارت سرے سے موجود ہی نہ تھی تو اسے خواب کے علاوہ بھلا اور کیا کہا جا سکتا تھا۔

واپس اپنے گھر کے قریب پہنچ کر ہم تانگے سے اترے تو فقیرا بولا کہو بھائی اب تو تمہیں یقین ہو گیا کہ وہ حقیقت نہیں فقط ایک خواب تھا۔ ایک ڈراونا اور بھیانک خواب میں نے جواب دیا کہ ہاں یار۔ اب تو مجھے بھی شک ہو رہا ہے کہ اس رات میں نے واقعی کوئی خواب ہی دیکھا تھا۔ کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک مہینے کے اندر اندر وہ عمارت اپنی جگہ سے غائب ہو جاتی۔ گو میں نے ابھی ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہاں کوئی عمارت نہیں ہے پھر بھی میرے چہرے پر الجھن کے آثار ظاہر تھے۔

وہ رات میں نے نہایت بے چینی میں کاٹی۔ نیند میری آنکھوں سے میلوں دور تھی میں بھی سوچ رہا تھا کہ آخر یہ کیا راز تھا۔ حالانکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہاں جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا جہاں ایک مہینہ پیشتر میں نے ایک شاندار مگر صدیوں پرانی ایک عمارت دیکھی تھی۔ مگر پھر بھی مجھے کچھ ایسا وہم ہو گیا تھا کہ مجھے اب بھی اسے ایک خواب سمجھنے میں تامل تھا میں سوچ رہا ہوں سوچ رہا۔ خیالات اور سوالات کا ایک سمندر تھا جو میرے دماغ میں بہہ رہا تھا۔ مگر مجھے اپنے ایک سوال کا جواب بھی نہیں مل پا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک ماہ پہلے میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا۔ وہ سچ تھا یا آج میری نگاہوں نے جو کچھ دیکھا ہے سچ ہے۔ میرا ذہن یہ گتھی سلجھانے سے قاصر تھا۔ حالات کی اس انوکھی کروٹ نے میرے دماغ کی چولیں ہلا دیں تھیں۔ میں دیر تک جاگتا رہا اور یہی سوچتا رہا کہ آخر اس انوکھے راز سے کس طرح پردہ ہٹایا جائے۔ ایک خیال یہ بھی ذہن میں آیا تھا کہ ممکن ہے کسی زمانے میں اس بھیانک عمارت کا واقعی کوئی وجود رہا ہو۔ نہ جانے کیوں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی بڑی بوڑھے سے مل کر یہ معلوم کیا جائے۔ شاید کچھ معلوم ہو جائے۔

دوسرے دن دس گیارہ بجے فقیرا مجھ سے ملا تو میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہہ دی پہلے تو وہ دل کھول کر ہنسا پھر بولا۔ یار رشید مجھے حیرت ہے کہ بات ختم ہونے کے باوجود تم اسے ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو، خیر میں چاہتا ہوں کہ تم اس واقعے کو مکمل طور پر بھول جاؤ۔ اس لیے چلو جو کچھ تم معلوم کرنا چاہتے ہو۔ معلوم کیے لیتے ہیں۔ شاید تم اس طرح اس واقعے کو بھلا سکو۔

اس کے بعد ہم نے محلہ قاضی پورہ کے دو تین بڑی عمر کے لوگوں سے ملاقات کی۔ مگر انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ مگر ہم نے ہمت نہ ہاری آخر کار ایک بزرگ ہمیں مل ہی گئے۔ ان کے متعلق پتہ چلا تھا کہ وہ شروع سے یہاں رہتے آئے ہیں۔

دل پھولوں کی بستی

خواتین کی مقبول مصنفہ **نگہت عبداللہ** کا انتہائی خوبصورت اور طویل ناول، **دل پھولوں کی بستی**، جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے، جلد کتاب گھر پر آرہا ہے۔ اسے کتاب گھر پر **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہم نے سلام کیا اور اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔ ہم نے ان کی عمر پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ میری عمر تقریباً اسی برس ہے ہمارے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ جب میری عمر دس گیارہ سال تھی تو ہم لوگ دہلی سے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان دنوں یہ محلہ نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ صرف چند گھرانے ہی یہاں رہتے تھے ہم نے بھی اپنا ایک کچا مکان یہاں بنایا اور رہنے لگے۔

ان دنوں یہاں سے کوئی تین چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک ویران عمارت موجود تھی، جو ایک عرصے سے خالی تھی آج کل جہاں علی جان شاہ کا علم والا مکان ہے۔ اسکے قریب ہی مشرق کی طرف وہ عمارت موجود تھی۔ لیکن صدیوں پرانی اس عمارت کے بارے میں نہایت عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں ہمیں ہمارے بزرگوں نے منع کر دیا تھا کہ ہم وہاں نہ جائیں۔ کیونکہ اس عمارت کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ آسیب زدہ ہے اور راتوں کو وہاں سے چیخوں، قہقہوں سازوں اور گھنگھروؤں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز میں ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے وہاں چلا گیا تھا لیکن عمارت کے قریب جاتے ہی خوا مخواہ مجھے اتنا ڈر اور خوف محسوس ہوا کہ میں سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا۔ اس کے بعد ہم بچوں کو اس طرف جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ کئی لوگ ایسے تھے جو بتاتے تھے کہ ہم نے اس ویران مکان سے رات کے وقت چیخوں اور قہقہوں کی بہت ڈراؤنی آوازیں سنی ہیں۔ اس مکان کے بارے میں ایسی ایسی خوفناک باتیں مشہور تھیں کہ لوگ دن کے وقت بھی وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک رات ہم لوگ سوئے ہوئے تھے کہ ہم نے دھماکے کی آواز سنی۔ تب صبح ہمیں پتہ چلا کہ وہ ویران پرانی عمارت گر چکی ہے۔ ان دنوں یہ محلہ تیزی سے آباد ہو رہا تھا۔ کچھ عرصے تک تو اس عمارت کا کھنڈر اور ملبہ یونہی پڑا رہا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ لوگ اپنے اپنے گھر بنانے کے لیے وہاں سے مٹی اور اینٹیں اٹھانے لگے اور ایک روز اس کھنڈر کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا لوگوں کو وہاں سے ٹوٹا ہوا فرنیچر بھی ملا جن میں چند ایک چیزیں سالم بھی تھیں۔ ہاں ان دنوں ہم نے یہ بات بھی سنی تھی کہ اس مکان کے کھنڈر سے دو انسانی ڈھانچے بھی ملے اور ایک چیتے کا ڈھانچہ بھی ملا تھا مگر کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کسی بہت بڑی بلی کا ڈھانچہ ہے۔ خدا جانے حقیقت کیا تھی لیکن ہم نے یہ بھی سنا تھا کہ کچھ لوگوں کو وہاں سے سونے کے شمع دان بھی ملے تھے۔ پھر تو سونے کے لالچ میں لوگ ان کھنڈروں کی مٹی تک اٹھا کر لے گئے اور وہاں کچھ بھی نہ رہا۔

بڑے میاں سے باتیں کر کے ہم لوگ واپس چلے آئے راستے میں فقیرا نے کہا۔ یار رشید بڑی عجیب بات ہے کہ تمہیں خواب میں ایسی چیزیں دکھائی دی ہیں جو واقعی کسی زمانے میں موجود تھیں۔ اس کے بعد بھی ہم بہت دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے میاں کی بات نے فقیرا کو چکرا دیا تھا لیکن میرا دماغ اور بھی الجھ کر رہ گیا تھا۔ مگر بہت سر کھپانے کے بعد اب مجھے بھی یقین ہو چلا تھا کہ واقعی میں نے خواب ہی دیکھا ہے۔

اس روز مجھے اسپتال سے آئے ہوئے پانچواں دن تھا کہ دوپہر کو امی نے مجھ سے پوچھا کہ رشید ایک بات پوچھوں سچ بتاؤ گے۔ میں نے کہا۔ ضرور امی پوچھو کیا بات ہے۔ ماں بولی سچ بتانا۔ تم اتنا سارا روپیہ اور زیور کہاں سے لائے ہو۔ یہ بات سن کر میں ششدر رہ گیا اور حیرت سے امی کا منہ تکنے لگا حقیقت یہ ہے کہ مجھے جو حیرت ناک واقعات پیش آئے تھے۔ انہوں نے مجھے اس قدر چکرا دیا تھا کہ ایک لمحے کو بھی مجھے چوری کے مال کا خیال نہیں آیا تھا۔ ان پراسرار واقعات نے میرے ذہن کو اتنا الجھا دیا تھا کہ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اب مجھے یاد آیا کہ میں ایک مہینہ اسپتال میں رہا تھا تو میرا اسپتال کا خرچ دواؤں کے پیسے اور ڈاکٹر کی فیس کہاں سے آئی تھی۔ جو امی نے پوچھا تو مجھے یاد آ گیا کہ میں نے بہت سارا روپیہ، انعامی بانڈ اور کچھ زیورات چوری کئے تھے۔ واقعہ والے روز بھی میں گھر آتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ شاید اسی وقت امی نے میرا سامان نکال کر کہیں رکھ دیا تھا اور میرا اس طرف ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ امی نے پھر پوچھا۔ تم جواب کیوں نہیں دیتے۔ چپ کیوں ہو۔ ادھر میرا ذہن پھر چکرا کر رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ خواب نہیں تھا۔ میں نے واقعی چوری کی تھی لوگ میرے پیچھے لگے تھے اور میں بھاگتا ہوا اس عمارت میں جا چھپا تھا۔ یہ چوری کا مال اس بات کا ثبوت تھا کہ اس رات میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔

حیرت سے میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی میں نے بمشکل امی سے بہانہ بنایا کہ وہ سامان میرے ایک دوست نے کچھ عرصہ کے لیے رکھ

دیا تھا کہ وہ پھر واپس لے لے گا۔ امی بولیں صاف کیوں نہیں کہتا کہ تو نے چوری کی ہے میں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ نہیں امی میں نے چوری نہیں کی۔ وہ سامان میرے ایک دوست کی امانت ہے۔ امی بولیں نہیں خوب جانتی ہوں۔ پہلے مجھے شک تھا۔ مگر اب یقین ہو گیا ہے کہ تم ضرور کہیں چوری کرنے جاتے ہو۔ ورنہ راتوں کو یہ چوروں کی طرح کالے کپڑے پہن کر اور پستول لے کر کہاں عبادت کرنے جاتے ہو۔ غرض ماں نے مجھے بہت برا بھلا کہا اور سارا سامان میرے سامنے لا کر پھینک دیا کہ جاؤ جس کا بھی ہو یہ سامان اسی کو جا کر دے آؤ۔ یہ کہہ کر میری ماں غصے میں بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

میں نے سامان پر ایک نظر ڈالی تو اس بری طرح اچھل پڑا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا پورا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ حواس معطل ہو کر رہ گئے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ٹانگیں بری طرح کپکپانے لگیں اور میں بے اختیار زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ وہ چیز ہی اتنی حیرت ناک تھی کہ مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہونے لگا۔ میرے سامنے زیورات بانڈز اور روپیہ کے علاوہ چمڑے کے کور میں لپٹی ہوئی وہ ڈائری بھی رکھی ہوئی تھی جو میں نے اس پراسرار مکان میں ڈھانچے والے کمرے سے اٹھائی تھی۔ ڈائری دیکھ کر میرے ہوش و حواس پر جیسے بجلی سی گر پڑی اور کچھ دیر تک دماغ نے کام کرنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ ڈائری کی موجودگی کا مطلب تھا کہ میں اس پراسرار مکان میں گیا تھا اور مجھ پر گزرنے والا ایک ایک واقعہ حقیقت پرمبنی ہے۔ لیکن پھر وہ مکان کہاں گیا۔ اگر وہ ایک خواب تھا تو پھر یہ ڈائری کہاں سے آ گئی۔

کچھ دیر بعد جب میں شاک سے سنبھلا تو میں نے روبوٹ کی طرح ساری چیزیں اور وہ پراسرار ڈائری اٹھائی اور اپنے کمرے میں آ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

میرا دوست فقیرا کہہ رہا تھا کہ میں نے ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ جب کہ ڈائری ایک ایسا ناقابل تردید اور ٹھوس ثبوت تھا کہ اسے دنیا کا کوئی انسان جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ دل تو چاہا کہ اسی وقت بھاگتا ہوا جاؤں اور فقیرا کو وہ ڈائری دکھا کر پوچھوں کہ اب بتا وہ خواب تھا یا حقیقت۔ لیکن میں نے سوچا کہ اسے پڑھنا چاہیے پہلے کہ حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ میں نے باقی چیزیں اپنی صندوق میں بند کر دیں اور اپنے بستر پر بیٹھ کر ڈائری پڑھنے لگا۔

ڈائری کی تحریر اردو تھی لیکن اوراق اتنے بوسیدہ ہو چکے تھے کہ ذرا سا زور پڑنے پر پھٹنے لگتے تھے۔ گو الفاظ ایک عرصہ گزر جانے کے باعث کافی دھندلے پڑ گئے تھے مگر چونکہ لکھائی موٹے الفاظ میں تھی اس لیے مجھے پڑھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔ ڈائری میں ترتیب وار تاریخ اور سن وغیرہ تھے جو ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے۔ جوں جوں میں اسے پڑھتا گیا حیرت سے میری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور ایک بار پھر میرا دماغ چکرانے لگا۔

☆☆☆

زیرو بلاسٹر

عمران سیریز سلسلے کا ایک اور خوبصورت ناول، مظہر کلیم کے باصلاحیت قلم کی تخلیق۔ اس ناول میں نہ صرف علی عمران ہے بلکہ کرنل فریدی بھی اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ عمران کے مقابل آ کھڑا ہوا ہے۔ ان دو عظیم جاسوسوں کا خوفناک تصادم پڑھنے کے لیے آپ کو انتظار کرنا ہوگا ناول زیرو بلاسٹر کا۔ جسے جلد ہی کتاب گھر پر ناول سیکشن میں پیش کیا جائے گا۔



ڈائری کوئی سوا سو سال پرانی تھی اور کسی غلام اکبر نامی کانسٹبل نے لکھی تھی۔ جو انگریزوں کے دورِ حکومت میں پولیس میں کام کرتا تھا۔ ڈائری کے شروع کے صفحات میں کانسٹبل غلام اکبر نے اپنی ملازمت سے پہلے اور پولیس کی ملازمت کے بعد کے واقعات، مشاہدات و حالات قلم بند کئے تھے جو ہمارے اور آپ کے لیے غیر ضروری ہیں۔ لہٰذا میں آپ کو ڈائری کا آخری حصہ اور اس میں درج ایسے واقعات سناؤں گا جو آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ چونکہ ڈائری میں طرزِ تحریر پرانے زمانے کا ہے اس لیے میں اپنی زبان میں آپ کو سناؤں گا۔

۱۲ مئی ۱۸۵۶ء: آج کل ہندوستانی عوام میں انگریزوں کے خلاف بہت غم و غصے کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے ہیں اور اس دھوکے باز اور بے غیرت قوم نے جس دغا بازی اور چال بازی سے ہندوستانی ریاستوں اور خاص طور پر دہلی کی مغل سلطنت کو اپنے بے رحم پنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ اس سے یہاں کے ہندوؤں اور خاص کر مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ سی بھڑک اٹھی ہے۔ آج کل ہندوستان کی جیلوں میں خود بچارے ہندوستانی ہی بھرے ہوئے ہیں جن میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے مشکل یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی آپس میں نہیں بنتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں قصور سراسر ہندوؤں کا ہے۔ مسلمان تو مفاہمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ مگر ہندو قوم خاصی تعصب پرست واقع ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان مکار انگریزوں نے آسانی سے ہندوستان پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اب یہ موقعہ پرست قوم ہر جگہ اپنی مرضی چلاتی ہے۔ ان دھوکا باز انگریزوں کا خاص نشانہ بے چارے مسلمان بنے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ ہندوؤں کو بھی نہیں معاف کرتے۔ انگریزوں کے ظلم اب بہت بڑھ گئے ہیں یہی سبب ہے کہ آج لاہور میں نامعلوم افراد نے ایک عمارت پر حملہ کیا ہے۔ جہاں انگریز رہتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ کئی انگریز بھی ہلاک ہو چکے ہیں۔

۱۳ مئی ۱۸۵۶ء: انگریز سرکار نے پہلے سے زیادہ سخت رویہ اختیار کیا ہے۔ آج پولیس کے بڑے آفیسر جے کے اینڈرسن نے بہت سے سپاہیوں کا تبادلہ لاہور کر دیا ہے۔ ان سپاہیوں میں میں بھی شامل ہوں۔ میں دو برس سے انگریز پولیس میں کانسٹبل ہوں۔ پہلے بھی کئی بار میرا تبادلہ مختلف شہروں میں کیا گیا ہے لیکن شکر ہے کہ میری بیوی مہتاب بی بی ایک بہادر اور دلیر عورت ہے۔ اس لیے ہم مصائب سے نہیں گھبراتے کل میں یہاں سے لاہور روانہ ہو جاؤں گا۔ کیا کروں غریب آدمی ہوں یہ پولیس کی نوکری بھی بڑی مشکل سے ملی ہے۔ اس لیے چھوڑ بھی نہیں سکتا پھر میرے دو بچے بھی ہیں ۹ سالہ نیاز حسین اور سات سالہ مختیار حسین آخر ان کے پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ مجھے افسوس تو ہے یہ کہ انہی تبادلوں میں میرے بچے تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔ مگر انگریز بڑی ظالم قوم ہیں اب یہی دیکھئے انہوں نے میرا ابھی تبادلہ کر دیا یہ بھی نہ سوچا کہ میں بال بچوں والا ہوں۔ مجھے کتنی تکلیف ہوگی۔ مگر انہیں فکر نہیں یہ ہماری ہی بدقسمتی تھی کہ ہم آپس میں ہی لڑ کر کمزور ہو گئے۔ ورنہ ایک غیر قوم سات سمندر پار کر کے ہماری سلطنت میں آ کر ہمارے اتنے بڑے ملک پر اس

طرح قبضہ نہیں کر سکتی تھی۔ پنجاب کا حال بھی یہی ہے پنجاب پر کچھ عرصہ پہلے تک سکھوں کی حکومت تھی۔ لیکن ۱۸۳۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد سکھ آپس میں لڑ پڑے۔ اس طرح انگریز جیسے مکار قوم کو موقع مل گیا اور صرف سات برس قبل ۱۸۴۹ء عیسوی میں انگریزوں کے ایک ظالم جنرل لارڈ ڈلہوزی نے پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں کمپنی کی فوج اور پولیس لگا دی ہے۔ ڈلہوزی نے پنجاب پر قبضہ کے دوران ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا ہے۔ کل لاہور میں جو ہنگامے ہوئے تھے تو ہمیں وہاں سے اس لیے بھیجا جا رہا ہے تاکہ ہم وہاں نظم و ضبط قائم رکھیں اور آئندہ انگریزوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

۱۵ مئی ۱۸۵۷ء: میں ایک روز پہلے اپنے بال بچوں سمیت یہاں لاہور پہنچ چکا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہیڈ کوارٹر میں جگہ خالی نہیں ہے کیونکہ مختلف مقامات سے کافی تعداد میں پولیس یہاں پہنچ چکی ہے میں فی الحال ایک سرائے میں ٹھہرا ہوا ہوں اور کسی کرائے کے مکان میں رہنا چاہتا ہوں اور کئی روز سے مکان تلاش کر رہا ہوں۔

۱۸ مئی ۱۸۵۶ء: ابھی کوئی کرائے کا مکان نہیں ملا ہے انگریزوں سے یہاں کے عوام سخت نفرت کرتے ہیں اور میں چونکہ انگریزی پولیس میں نوکری کر رہا ہوں۔ اس لیے مجھے بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کوئی آدمی بھی مکان دینے کو تیار نہیں ہے ان بچاروں کو کیا پتہ کہ ہم ہندوستانی پولیس والوں کے ہمدردیاں بھی عوام کے ساتھ ہیں اور ہم خود بھی انگریزوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ بس اس پیٹ کا مسئلہ ہے ورنہ میں آج ہی یہ نوکری چھوڑ دیتا۔

۲۰ مئی ۱۸۵۶ء: ابھی تک سرائے میں ہوں۔ کوشش کے باوجود کرائے کا مکان نہیں مل سکا ہے گو سرائے کا کرایہ زیادہ نہیں ہے لیکن وہاں بیوی بچوں سمیت رہنا اچھا نہیں لگتا۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی سرائے میں رہتے ہیں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ کوئی مکان مل جائے۔ چند پولیس والے بھی سرائے میں رہتے ہیں اور وہ سب کے سب بیچارے مسلمان ہیں۔ یہاں میرا نہ کوئی رشتہ دار ہے نہ جان پہچان والا ہے۔ ویسے کرائے کے مکان تو بہت سے ہیں لیکن وہی

مقید خاک

ساحر جمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول...... مقیدِ خاک...... سرزمین فراعنہ کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیر خیز داستان۔

ڈاکٹر شکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مردہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلا تھا...... یوساف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا...... یوسا:- ایک حرماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا...... مریاقس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسدِ خاکی میں مقید تھی...... شیلندر رائے ہریجہ:- ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹر، اسے صدیوں پرانی ممی کی تلاش تھی...... مہر جی:- پرکالۂ آفت، انسانی قالب میں ڈھلی ایک آسمانی بجلی...... ایکشن، سسپنس اور تھرل کا ایک نہ رکنے والا طوفان......

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے، جسے ایکشن ایڈونچر مہم جوئی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

نفرت کا معاملہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مکان نہ ملنے کے دو بڑے اسباب ہیں۔ اول یہ کہ جس روز سے یہاں انگریزی پولیس نے لاہور کے نہتے عوام پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا ہے۔ بے قصور شہریوں پر لاٹھیاں برسائی جاتی ہیں اس لیے یہاں کے غیور عوام کتے کو تو جگہ دے سکتے ہیں لیکن انگریزی پولیس کو نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مجھے پانچ بجے شام کو ڈیوٹی سے اترنا ہوتا ہے اس لیے مکان تلاش کرنے کے لیے میرے پاس وقت زیادہ نہیں بچتا اور پھر معاملہ سرائے کا ہے اس لیے مجھے جلدی بیوی بچوں کے پاس پہنچنا پڑتا ہے۔

۲۳ مئی ۱۸۵۶ء: ہمارا صوبے دار صاحب دھرم داس نامی ایک ہندو ہے۔ وہ بڑا نرم دل اور مہربان آفیسر ہے۔ آج میں نے اس سے اپنی مشکل بیان کی تو وہ بولا۔ دیکھو جوان! ہیڈ کوارٹر میں تو بالکل جگہ خالی نہیں ہے۔ یہاں بھی سب بال بچے والے لوگ رہتے ہیں اس لیے انہیں نکال نہیں سکتا ویسے ایک راستہ ہے ایک بوڑھا انگریز میرا دوست ہے اس کا ایک مکان شاید خالی ہے۔ لیکن وہ مکان شہر سے ذرا باہر ہے اگر تم وہاں رہنا چاہو تو میں تمہیں چٹھی لکھ کر دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں مکان دے دے گا اور میں اسے لکھ دوں گا تو وہ تم سے کرایہ بھی نہیں لے گا۔ ویسے بھی وہ بہت امیر آدمی ہے اس کرائے کی فکر بھی نہیں ہوگی۔ میں یہ بات سن کر بیحد خوش ہوا اور میں نے وہاں رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ صوبہ دار صاحب نے مجھے چٹھی لکھ کر دے دی ہے میں نے صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں شام کو انگریز سے ملنے جاؤں گا۔

۲۴ مئی ۱۸۵۶ء: میں کل شام کو ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد اس انگریز جس کا نام ولسن ہے سے ملنے گیا تھا۔ میں نے اسے صوبہ دار صاحب کی چٹھی دی، جسے پڑھ کر نہ جانے کیوں وہ خوفزدہ ہو گیا۔ مگر جلد ہی خود پر قابو پا کر بولا۔ دیکھو مسٹر اکبر میں وہ مکان کسی کو ہرگز کرائے پر نہ دیتا لیکن چونکہ تم میرے دوست کی چٹھی لائے ہو اس لیے تم شوق سے وہاں رہ سکتے ہو۔ مگر دو باتیں میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔ اول یہ کہ اس مکان کے بارے میں لوگ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مکان آسیب زدہ ہے لیکن میں ایسی خرافات پر یقین نہیں کرتا اور پھر آج تک مجھے وہاں کوئی چیز نہیں نظر آئی۔ ویسے وہ مکان بہت عرصے سے خالی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا وہاں بہت قیمتی سامان بھی موجود ہے جو اوپر کے ایک بند کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اوپر اور نیچے بہت سا پرانا مگر قیمتی فرنیچر وغیرہ موجود ہے۔ اگر تم رہنا چاہو تو نچلے حصے میں رہ سکتے ہو مگر اوپر کی منزل تم استعمال نہیں کرو گے اس کے علاوہ نیچے کا فرنیچر وغیرہ تم بے شک استعمال کر سکتے ہو۔ دوسرے، میرے سارے سامان کا تمہیں خیال رکھنا پڑے گا۔ اس کی ذمہ داری تمہیں لینی پڑے گی۔ میرے دوست نے تمہیں بھیجا ہے۔ اس لیے مجھے تم پر یقین ہے۔ ویسے بھی تم ہماری پولیس میں ہو اس لیے مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تم سے کرایہ بھی نہیں لوں گا۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا کہ میرا وہاں رہنا ٹھیک ہوگا یا نہیں۔ مجھے اپنی تو کوئی فکر نہ تھی لیکن بیوی بچوں کی فکر ضرور تھی کہ کہیں ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ لیکن میں مجبور تھا۔ مجھے مکان کی اشد ضرورت تھی اس لیے میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں بھی آخر مسلمان ہوں اور بھوتوں چڑیلوں پر مجھے بھی یقین نہیں ہے۔ مگر ایک بات میں نے صاف محسوس کی کہ جتنی دیر تک میں بوڑھے ولسن سے باتیں کرتا رہا۔ ولسن کی نظریں مجھ پر ہی جمی رہیں اور اس کی آنکھوں میں تشویش اور خوف کے سائے لرزاں دیکھے۔ پتہ نہیں کیوں۔ بہرحال مجھے آمادہ پا کر اس نے اپنی میز کی نچلی دراز سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر مجھے دیا جس میں چھ

چابیاں تھیں۔ وہ بولا کہ یہ نیچے کے پانچ کمروں اور ایک بیرونی دروازے کے قفل کی چابیاں ہیں میں نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا تو وہ پھر کہنے لگا کہ دیکھو مسٹر اکبر نیچے کے ہر کمرے میں سونے کا ایک ایک شمع دان بھی ہے۔ میں تمہیں ایک بار پھر تاکید کرتا ہوں کہ میرے سارے سامان کی ذمہ داری بہر حال تم پر ہوگی۔ البتہ اوپر کے تین کمرے کھلے ہوئے ہیں اور ان میں فرنیچر کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔ تم بہر حال نیچے کے حصے میں رہو گے۔ مجھے تم ایک شریف انسان لگتے ہو۔ اس لیے میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں رہا تھا۔ آخر میں اس نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا مگر اس طرح جیسے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ رہا ہو۔ میں اس کے طرز عمل کو سمجھ تو نہ سکا لیکن بہت متاثر ہوا۔ میں واپس لوٹا تو بے حد خوش تھا۔ کیونکہ میرا ایک بڑا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔

۲۵ مئی ۱۸۵۶ء: آج دوپہر کو اپنے افسر سے تھوڑی دیر کی اجازت لی اور اپنی پیاری بیگم اور دو بچوں نیاز حسین اور مختیار حسین کے ساتھ اس مکان میں آ گیا ہوں۔ مکان ایک منزلہ ہے۔ نیچے پانچ کمرے ہیں اور اوپر چار کمرے ہیں۔ دو لکڑی کے زینے بھی اوپر جانے کے لیے ہیں۔ لیکن مکان بے حد پرانا ہے میرے اندازے کے مطابق کوئی تین چار سو سال تو ضرور پرانا ہوگا۔ مکان میں ہر جگہ صدیوں کی گرد جمی ہوئی ہے۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا ہے۔ ہر طرف مکڑیوں نے جالے بن دیے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک عرصے سے یہاں کوئی نہیں آیا۔ مکان میں چاروں طرف ویرانی برس رہی ہے سیاہ لکڑی کے بنے ہوئے منقش دروازے اور کھڑکیاں پرانی ہونے کے باوجود بے حد مضبوط ہیں۔ یہی حال یہاں کے فرنیچر کا ہے میزیں، کرسیاں، الماریاں اور پلنگ سب کے سب سیاہ لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ سارا سامان بھی بے حد قدیم لگتا ہے۔ نہ جانے کس زمانے کا ہے۔ ہم نے مکان کی صفائی کر دی ہے۔

۲۷ مئی ۱۸۵۶ء: صفائی کے بعد یہ مکان اب کسی حد تک رہنے کے قابل ہو گیا ہے۔ ایک بات میں نے پہلے دن ہی سے محسوس کی ہے کہ یہاں ہر جگہ خوف کی فضا قائم ہے۔ بغیر کسی سبب کے دل دھڑکنے لگتا ہے اور خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ یہاں کچھ بھی نہیں بس صرف اتنا ہے کہ مکان شہر سے کچھ باہر ہے لیکن پھر بھی آنے جانے میں تکلیف نہیں ہوتی۔ خوف کے بارے میں پہلے میں نے سوچا کہ یہ شاید میرا وہم ہے کیونکہ مسٹر والسن نے بتایا تھا کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ شاید وہی خیال میرے دل میں بیٹھ گیا ہے۔ مگر میری بیوی نے بھی کہا کہ یہاں نہ جانے کیوں خوف محسوس ہوتا ہے تو میں حیران ہوا خیر گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میری ڈیوٹی شام پانچ بجے ختم ہوتی ہے اس کے بعد میں سیدھا گھر آ جاتا ہوں۔ پھر باہر نہیں جاتا۔

۲۹ مئی ۱۸۵۶ء: یہاں ہمیں آئے چار روز گزر چکے ہیں لیکن ہر طرف خیریت ہے۔ پہلے مجھے اپنی بیوی بچوں کے بارے میں جو تھوڑی بہت تشویش تھی۔ وہ بھی اب جاتی رہی ہے اب محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے خواہ مخواہ اس مکان کے بارے میں غلط افواہیں اڑائی تھیں۔ جب کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے ہم نچلے حصے میں رہتے ہیں کیونکہ پانچ کمرے ہمارے لیے بہت ہیں میری بیوی نماز وغیرہ پڑھتی ہے۔ بچے بھی سارا دن کھیلتے رہتے ہیں۔ البتہ انہیں اوپر جانے سے منع کر دیا گیا ہے اور

ہم بھی اوپر نہیں جاتے۔ میری بیوی دونوں بچوں کو خود ہی قرآن مجید پڑھاتی ہے۔ ویسے میں پہلے ہی دن اوپر کے تین کمروں کو دیکھ چکا تھا۔ البتہ ایک کمرہ مقفل ہے جس میں بوڑھے واٹسن کے کہنے کے مطابق کچھ قیمتی سامان موجود ہے جس میں سونے کے کچھ شمع دان بھی تھے اور فرنیچر بھی باقی تین کمروں میں بھی فرنیچر ہے البتہ مجھے اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ اس عمارت میں اتنا قیمتی سامان موجود تھا پھر یہ سارا سامان اب تک چوروں کی دست برد سے کس طرح بچا ہوا تھا یہ ٹھیک ہے کہ نیچے کے کمرے مقفل تھے لیکن چور حضرات ایسے بند تالوں کو کب خاطر میں لاتے ہیں پھر میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ چور اس مکان کی ڈراؤنی فضا سے خوفزدہ ہو گئے ہوں یا اب تک چوروں کا ذہن اس مکان کی طرف گیا ہی نہ ہو حالانکہ یہ دونوں باتیں حلق سے نہیں اترتی تھیں۔ بہر حال سبب کچھ بھی ہو۔ لیکن ایک اور بات بھی مجھے بڑی عجیب محسوس ہو رہی تھی کہ جب مکان میں اتنا ہی قیمتی سامان موجود تھا تو مسٹر واٹسن نے کس طرح اسے نظر انداز کر دیا اور یہ سامان یہاں سے اٹھا کر اپنے شہر والے مکان میں کیوں منتقل نہیں کیا۔ یہ ساری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں خیر اس کا سبب کچھ بھی ہو ہم میاں بیوی مطمئن ہیں کہ سر چھپانے کا ٹھکانہ مل گیا ہے۔ وہ بھی بغیر کرائے کے۔

۷ جون ۱۸۵۶ء: نہ جانے کیوں۔ دن بدن یہ احساس شدت سے بڑھتا جا رہا ہے کہ ہمارے علاوہ بھی یہاں کوئی ضرور رہنے لگا ہے۔ حالانکہ ہمیں آج تک کوئی نظر نہیں آیا ہے۔ نہ ہی ہم نے کسی کی آواز سنی ہے۔ پھر بھی ہم اس کا کوئی سبب نہیں جان سکے ہیں یہ بے جا خوف اور اس مکان میں کسی نادیدہ ہستی کی موجودگی کا احساس نہایت عجیب ہے۔

۸ جون ۱۸۵۶ء: رات ایک انوکھا اور عجیب واقعہ پیش آیا میری بیوی اور دونوں بچے سوئے ہوئے تھے اور میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ دفعتاً مجھے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہوئے میں نے غور سے سنا تو پتہ چلا کہ آواز اوپر سے آ رہی ہے۔ یوں جیسے اوپر کے کمرے میں کوئی چل پھر رہا ہے۔ میں نے جیب سے گھڑی نکال کر وقت دیکھا تو بارہ بجے تھے۔ میں نے کتاب رکھ دی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر آواز تھوڑی دیر میں ہی بند ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی چور تو نہ تھا لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ کیونکہ عقب سے اس مکان میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ جب کہ بیرونی دروازہ بھی بند تھا۔ اب مکان پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید مجھے دھوکہ ہوا ہے۔ خیر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر نہ جانے کب میں نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا۔

انکا

انکا...... چھانج کی گڑیا، ایک قتالہ عالم، آفت کی پڑیا۔ پراسرار قوتوں کی مالک، خوش قسمتی کی دیوی، جس کے حصول کے لیے بڑے بڑے پجاری اور عالم سر توڑ کوششیں کرتے تھے۔ ایک ایسی داستان جس نے سالوں تک پراسرار کہانیوں کے شائقین کو اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ **انکا**...... اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ بہت جلد **کتاب گھر پر جلوہ افروز ہو رہی ہے۔**

۹ جون ۱۸۵۶ء: رات پھر ایک واقعہ ایسا پیش آیا ہے جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ رات تقریباً ایک بجے میری بیوی نے مجھے نیند سے اٹھایا اور بولی کہ سنو اوپر سے آوازیں آ رہی ہیں۔ میں نے غور سے سنا تو واقعی آواز آ رہی تھی قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ جیسے اوپر کوئی چل رہا ہو۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد آواز بند ہو گئی۔ مگر زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ معاً ایک آواز آنے لگی یہ سسکیوں کی آواز تھی جیسے کوئی عورت چپکے چپکے رو رہی ہو۔ میری بیوی کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے۔ میں خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ مگر میں نے بیوی کو تسلی دی۔ میں حیران تھا کہ اوپر کے تینوں کمرے تو خالی ہیں جبکہ ایک کمرہ نہ جانے کتنی مدت سے بند ہے۔ کیا یہ آوازیں اسی کمرے میں بلند ہو رہی ہیں۔ مجھے عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے۔ میں اپنے بستر سے اٹھا تاکہ باہر نکل کر دیکھوں مگر ابھی دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ دفعتاً آواز بند ہو گئی اور پوری عمارت میں خاموشی طاری ہو گئی۔ اب مجھے بھی شک ہونے لگا ہے کہ یہ پراسرار مکان واقعی آسیب زدہ ہے۔ پہلے روز سے ہمارے دلوں پر چھائی ہوئی بے سبب کی دہشت اس ویران مکان کا یہ غیر فطری سناٹا اور اب یہ آوازیں ہمیں یہ بتا رہی تھیں کہ مکان کے بارے میں لوگوں کا کہنا بالکل درست ہے۔

۱۱ جون ۱۸۵۶ء: اب مجھے کچھ یقین سا ہو چلا ہے کہ اس مکان میں ضرور کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ دن کو میں نے اوپر کے کھلے ہوئے کمروں کا جائزہ لیا۔ دیواروں کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھا تھا۔ لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ آوازیں اب ہر روز سنائی دینے لگیں ہیں۔ مگر صرف رات کو ہی سنائی دیتی ہیں۔ کبھی کسی کے چلنے کی آواز کبھی سسکیوں اور رونے کی آوازیں۔ اب پھر مجھے اپنی بیوی اور بچوں کی طرف سے تشویش رہنے لگی ہے۔ میری بیوی حالانکہ ایک بہادر عورت ہے مگر آخر کو ایک کمزور عورت ہی ہے۔ میرے دونوں معصوم بچے بھی اب دن بھر سہمے سہمے آسیب کے قبضے میں ہے۔ جب سے آوازیں سنائی دینے لگی ہیں ہم ایک شمع دان برآمدے میں بھی جلاتے ہیں۔ ویسے شروع سے ہی ہم سب لوگ ایک ہی کمرے میں رات کو سوتے ہیں۔

۱۲ جون ۱۸۵۶ء: ایک عجیب بات میں نے محسوس کی ہے کہ وہ شیطانی آوازیں ہمیشہ رات بارہ بجے سے شروع ہوتی ہیں۔ رات تو ایک حیرت انگیز بات وقوع پذیر ہوئی۔ رات بارہ بجے جب آوازیں شروع ہوئیں تو پہلے ہلکی سی دھمک سنائی دی پھر اچانک ایک بھیانک چیخ گونجی اور ہمارے دل دہل کر رہ گئے۔ یہ چیخ کسی عورت کی تھی۔ جیسے کسی کا گلا گھونٹا جا رہا ہو۔ پھر یہ آواز آہستہ آہستہ سسکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ آواز اتنی پر اثر تھی کہ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ چیخ کی خوفناک آواز سن کر دونوں بچے گھبرا کر جاگ اٹھے تھے اور میری بیوی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بچے اب خوفزدہ ہو کر رونے لگے تھے میں نے دونوں بچوں اور بیوی کو تسلی دی اور ہم نے قرآنی آیات پڑھنی شروع کر دیں۔ جلد ہی سسکیوں کی وہ دردانگیز آواز بند ہو گئی مگر ابھی دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ دفعتاً ایک بھیانک قہقہہ گونجا جس نے درو دیوار ہلا کر رکھ دیے ۔ میں قرآنی آیات کا ورد کرتا ہوا باہر نکلا تو یکلخت آوازیں بند ہو گئیں۔ میں بے حد پریشان ہوں۔

۱۳ جون ۱۸۵۶ء: میں نے پھر کسی دوسرے مکان کی تلاش شروع کر دی ہے۔ ساتھ ہی کسی بزرگ ہستی کی بھی۔ جو ہمیں اس عذاب سے نجات دلا سکے۔ ویسے اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اگر کل تک مجھے کوئی کرائے کا مکان یا کسی بزرگ کا پتہ

نہ ملا تو میں یہ منحوس مکان چھوڑ دوں گا۔ مجھے اپنی زندگی کی کوئی فکر نہیں ہے مگر اپنی بیوی اور بچوں کا خیال ضرور ہے حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ عمارت کے بھوت ہمیں فقط ڈرا رہے ہیں۔ وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ لیکن پھر بھی میں اپنے بیوی بچوں کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ میں اب بے حد فکر مند رہنے لگا ہوں۔ رات کو پھر وہی شیطانی آوازیں سنائی دی تھیں۔ اب اس بات میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ یہ پراسرار مکان آسیب کے قبضے میں ہے۔

۱۴ جون ۱۸۵۶ء: آج ایک دوست کی زبانی پتہ چلا کہ شہر میں آج کل ایک بزرگ ہستی کا بڑا چرچا ہے۔ وہ خدا کے پیارے بندے ہیں۔ ان کے پاس ہر وقت لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے لوگ دور دور سے ان کے پاس اپنی مرادیں پوری کرانے کے لیے آتے ہیں۔ دوست کی زبان سے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا ذکر سن کر میں بے قرار ہو گیا۔ میں خود ہی کسی ایسے ہی بزرگ کی تلاش میں تھا جو مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے۔ جس سے آج کل میں دوچار تھا۔ شام کو ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد میں ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ واقعی جیسا سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کر انہیں پایا۔ وہاں پہلے سے لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ اس میں کئی بیمار لوگ بھی میں نے دیکھے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی ایک حیران کن واقعہ پیش آیا۔ ایک خانقاہ وہاں بنی ہوئی تھی۔ خانقاہ کے باہر بھی بے شمار لوگ موجود تھے لیکن وہ بزرگ خانقاہ کے اندر تھے میں ابھی باہر ہی تھا کہ اندر سے ایک شخص برآمد ہوا اور ادھر ادھر دیکھ کر سیدھا میری طرف آیا اور بولا کہ آپ کا نام ہی غلام اکبر ہے۔ میں بہت حیران ہوا اور اثبات میں سر ہلایا۔ تو وہ شخص بولا کہ چلئے آپ کو بابا جی یاد کر رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں ششدر رہ گیا۔ میں تو ابھی ابھی یہاں پہنچا تھا لیکن اتنی جلدی بابا جی کو میری آمد کا علم بھی ہو گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ بابا جی واقعی ایک روشن ضمیر بزرگ تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میرے حالات سے باخبر ہو چکے تھے۔ بہر حال اس شخص کے ساتھ میں اندر داخل ہوا تو اس نے ایک حجرے کے دروازے پر لا کر مجھے چھوڑ دیا اور اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ وہاں ایک باریش پر تقدس اور نورانی صورت بزرگ ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے۔ ان کے چہرے پر نور ہی نور پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سلام کیا تو انہوں نے سلام کا جواب دے کر فرمایا بیٹے اکبر میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ جب میں ان کے سامنے ادب سے بیٹھ گیا تو وہ یوں گویا ہوئے۔ اکبر بیٹے تمہارا نام تمہاری ماں باپ نے بہت خوب رکھا ہے۔ لیکن شاید تمہیں یہ علم نہیں کہ تم کتنی بڑی مصیبت میں گھرے ہوئے ہو۔ مگر تم فکر مند نہ ہو شہیدوں کا رتبہ بہت بلند ہوتا ہے۔ بزرگ کی باتیں میری سمجھ میں کچھ آئیں کچھ نہ آئیں لیکن اس کے بعد انہوں نے جو کچھ فرمایا۔ اسے سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

ان کی باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ آج سے تقریباً تین سو سال قبل جب ہندوستان پر اکبر اعظم کی حکومت تھی۔ اس زمانے میں مغل شہنشاہ اکبر کی فوج کا ایک سردار نصیر خان بھی تھا جو فوج میں پانچ ہزاری منصب پر فائز تھا۔ وہ شکار کا بہت شوق رکھتا تھا ایک بار وہ شکار کھیلنے جنگل میں گیا تو اسے جنگل میں ایک نہایت حسین وجمیل عورت روتی ہوئی ملی۔ عورت کا کہنا تھا کہ اس کے مرد کو ایک شیر پکڑ کر لے گیا ہے۔ سردار نصیر خان کو اس عورت کے حسن نے بہت متاثر کیا اور وہ عورت کو اپنے آبائی شہر لاہور لے آیا اور عورت سے شادی کر لی۔ اس خوب صورت عورت نے نصیر خان کو اپنا نام کامنی بتایا تھا۔ نصیر خان کی پہلی ہی تین بیویاں موجود تھیں۔ لہٰذا اس نے کامنی کے لیے لاہور میں ایک الگ شاندار عمارت بنوائی۔ نصیر خان نے اپنی چہیتی بیوی کامنی کو اس عمارت میں رکھا۔ جہاں نوکروں کے علاوہ کوئی نہ رہتا تھا۔ کامنی دراصل ایک بدروح تھی۔

ملازمین نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا مکان کے مالک نصیر خان کے جسم سے دن بدن خون کم ہوتا جا رہا ہے۔ بالآخر صرف دو مہینے کے اندر نصیر خان اس حالت میں مر گیا کہ اس کے جسم میں خون کی ایک بوند تک نہ رہی۔

نصیر خان کی موت کے بعد اس کی نئی عمارت کے ارد گرد کے علاقے سے بچے گم ہونے لگے۔ تب بھی مرحوم نصیر خان کی حسین بیوی کامنی کی طرف کسی کا شک نہیں گیا۔ مگر انہی دونوں ایک ملازم نے اتفاق سے کامنی کو اس کے کمرے میں اس خوفناک حالت میں دیکھا کہ اس کے آگے کے دو دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے اور وہ ایک بچے کی لاش کو اپنے دانتوں سے جھنجھوڑ رہی تھی۔ یہ ہیبتناک منظر دیکھ کر ملازم ہزیانی انداز میں چیخیں مارتا ہوا باہر بھاگا اور اس نے سب کو اس بھیانک واقعے سے آگاہ کر دیا۔ سارے ملازمین اس بھیانک عمارت کو اسی وقت خالی کر گئے۔ مگر جب غم اور غصے میں بپھرا ہوا ایک ہجوم کامنی کی تلاش میں اس عمارت میں داخل ہوا تو وہاں تہہ خانے میں انسانی بالوں کے انبار کے سوا کچھ نہ تھا۔ کامنی غائب تھی اور وہ آج تک کسی کے ہاتھ نہ آ سکی۔ لیکن اسے اس کے بعد بھی بارہا اس عمارت میں دیکھا گیا۔ وہ عمارت آج تک ویران ہے اور اس ویران عمارت پر آج بھی اس خونخوار بدروح کا قبضہ ہے۔

لیکن میرے لیے خود پر قابو رکھنا اس وقت دشوار ہو گیا۔ جب ان بزرگ نے مجھے بتایا کہ یہ وہی عمارت ہے جہاں آج کل میں قیام کیے ہوئے ہوں۔ یہ سنتے ہی میرا جسم کسی انجانے خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور کچھ دیر کے لیے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خونی کھیل کا آغاز ہو چکا ہے کچھ دیر کے بعد جب میرے حواس واپس آئے تو میں بزرگ کے قدموں پر گر پڑا اور گڑ گڑا کر کہا۔ باباجی میرے بچوں کو اس بدروح سے بچا لیں۔ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ مجھے برباد ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ باباجی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو مجھے کچھ قرار سا آیا۔ باباجی نے فرمایا۔ یاد رکھو اکبر بیٹے یہ زندگی چند روزہ ہے۔ اصل زندگی تو دوسری ہے۔ ابدی زندگی میں بہت سکون ہے آرام ہے۔ خاص کر شہیدوں کے لیے ہم جانتے ہیں ہم دیکھ رہے ہیں۔ مگر مشیت ایزدی کچھ اور ہے۔ اب تمہاری ایک شاندار زندگی شروع ہو گی۔ غموں اور دکھوں سے پاک زندگی۔ لو یہ تعویذ رکھ لو جب تک یہ تمہارے پاس ہے۔ کوئی بھی بدروح کوئی بلا تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ لو لے لو یہ کہہ کر انہوں نے ایک تہہ کیا ہوا تعویذ میری طرف بڑھایا۔ تعویذ میرے ہاتھ میں آتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دل سے سارا خوف ساری وحشت پل بھر میں غائب ہو گئی۔ پھر باباجی نے فرمایا۔ جاؤ بیٹے اب گھر جاؤ۔ لیکن صبر کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ انسان بہت کمزور ہے۔

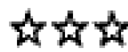
میں انہیں سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ باہر نکلا تو باباجی کی باتیں یاد آنے لگیں حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے آخر میں جو کچھ کہا تھا وہ صاف طور پر میری سمجھ میں نہ آ سکا تھا۔ البتہ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ بدروح صدیوں سے زندہ چلی آ رہی تھی لیکن آج تک کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔

میں جب گھر پہنچا تو میری بیوی اور بچے تینوں ہی سہمے اور گھبرائے ہوئے تھے۔ خوف اور سراسیمگی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔ میری بیوی کی مارے ڈر کے آواز نہیں نکل رہی تھی پتہ چلا کہ آج خلاف معمول دن کو بھی ڈراونی آوازیں سنائی دی تھیں بیوی کہہ رہی تھی کہ خدا کے لیے یہاں سے کہیں اور چلو۔ ورنہ ہمارا دم نکل جائے گا۔ میں نے بیوی بچوں کو تسلی دی کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آوازیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ویسے تم فکر مت کرو۔ میں ایک بزرگ سے تعویذ لے آیا ہوں۔ انشااللہ ہمیں اب کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں نے وہ تعویذ بیوی کو دیا۔ تعویذ ہاتھ میں لیتے ہی اس کا سارا خوف بھی جاتا رہا۔ بے شک خدا کے کلام میں بڑی طاقت ہے پھر بھی میں نے بیوی سے کہہ دیا ہے کہ بس ایک دن اور

صبر کرلو اگر پرسوں تک کوئی مکان نہیں ملا تو پھر ہم سرائے میں ہی چل کر رہیں گے۔ بیوی تو مطمئن ہوگئی مگر کیا کروں، بچوں کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔

رات کو کھانے کے بعد جب میں بستر پر لیٹا تو ایک بار پھر بزرگ کی باتیں یاد آئیں۔ اب جو میں نے غور کیا تو کچھ پریشان سا ہوگیا۔ بزرگ کہہ رہا تھا کہ مشیت ایزدی کچھ اور ہے اور مجھے صبر کرنا چاہیے۔ تو کیا کچھ ہونے والا ہے۔ میرے دل میں تو اب اپنے بچوں کی طرف سے خوف پیدا ہوگیا تھا۔ شاید جلد ہی یہ مکان اب چھوڑ دوں۔ رات بھی وہ شیطانی آوازیں سنائی دیں اور پر خوب دھما چوکڑی مچی۔ قہقہے سنائی دیے سسکیوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ ہم سب گھبرا کر اٹھ گئے۔ بیوی دونوں بچوں کو گود میں لیے آیات پڑھتی رہی۔ حالانکہ تعویذ کی وجہ سے اس کا خوف ختم ہوگیا ہے۔ لیکن پھر بھی آرام حرام ہوکر رہ گیا ہے نیند نہیں آتی گو میرے پاس سرکاری بندوق بھی ہے اور اپنی تلوار بھی۔ پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تلوار ان بدروحوں کا کیا بگاڑ لے گی۔ جب کہ بندوق استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

آدھی رات کو چیخ سن کر اوپر بھی گیا لیکن آواز دفعتاً بند ہوگئی میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر کچھ نہ تھا۔ یوں لگتا ہے کہ کوئی ہے ضرور مگر نظر نہیں آتا میں خود بھی خوفزدہ ہوگیا ہوں مگر مجھے زیادہ فکر بچوں کی ہے۔"



آتش پرست

وجیہہ سحر کے کہنہ مشق قلم سے ایک اور سنسنی خیز اور دلچسپ ناول۔ ماہرین آثار قدیمہ ایک چار ہزار سال پرانی ممی دریافت کرتے ہیں۔ جسے اس انداز میں حنوط کیا گیا تھا کہ وہ آزاد ہوتے ہی زندہ ہو جائے۔ چار ہزار سال پرانی ممی کے ہنگامے، خوف و ہراس اور قتل و غارت۔ آج کی دُنیا کو اس منحوس ممی سے کیسے چھٹکارا دلایا گیا، جاننے کے لیے پڑھیے..... **آتش پرست**

جسے جلد ہی کتاب گھر پر **ایکشن ایڈونچر مہم جوئی ناول** سیکشن میں پیش کیا جائے گا۔

شیطان صاحب

عمران سیریز اور جاسوسی دُنیا جیسے بہترین جاسوسی اور سراغرسانی سلسلے کے خالق اور عظیم اُردو مصنف ابن صفی کے شریر قلم کی کاٹ دار تحریروں کا انتخاب۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل یہ انتخاب یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ شیطان صاحب کو کتاب گھر پر **طنز و مزاح** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔



میں اپنے کمرے میں بیٹھا ڈائری پڑھ رہا تھا کہ امی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ میرے لیے کھانا لے کر آئی تھیں۔ مجھے بھوک تو نہ تھی مگر میں نے کھانا لے لیا۔ کھانے کے بعد میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ امی برتن وغیرہ واپس لے جاسکیں، کھانے سے فارغ ہو کر میں نے پھر کانسٹیبل غلام اکبر کی حیرت ناک ڈائری پڑھنی شروع کر دی۔

۱۵جون ۱۸۵۶ء: اب اس مکان میں رہنا بھی ممکن نہیں رہا۔ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ آج تو حد ہو گئی ہے۔ میں شام کو گھر آیا تو بیوی رو رہی تھی اور بچے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بیوی بچے مجھ سے لپٹ گئے بیوی نے روتے ہوئے بتایا کہ دوپہر کو ایسی آواز آئی جیسے کوئی زینے سے نیچے اتر رہا ہو۔ زینہ چر چرا رہا تھا۔ اچانک ایک خوفناک قہقہہ گونجا آواز کسی عورت کی تھی۔ تعویز میرے پاس تھا میں کمرے سے نکلی تو دیکھا کہ زینے کے اوپر ایک بھیانک عورت کھڑی تھی اس نے کالے رنگ کے میلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ جن میں مٹی جمی ہوئی تھی۔ اس کے آگے کے دو دانت بہت لمبے تھے جو منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس چڑیل کو دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ اس کے حلق سے ہیبت ناک قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر دفعتاً اس کے قہقہے رک گئے۔ وہ بولی تو اس کے منہ سے گھر گھراتی ہوئی آواز نکلی۔ وہ کہہ رہی تھی تم لوگوں کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے کافی عرصے سے تازہ خون نہیں ملا۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ ہاہا ہا اس کے حلق سے پھر قہقہے نکلنے لگے اور میں چیختی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔ میں نے دیکھا کہ بیوی کو ہلکا ہلکا بخار تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی بچوں کی حالت بھی خراب تھی۔

بیوی کی یہ بات سن کر بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ باباجی کا کہا پورا ہو چکا ہے اس مکان پر ایک بدروح کا قبضہ ہے جو سینکڑوں برس سے زندہ انسانوں کا خون پیتی آ رہی ہے۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہاں سے کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔ اب میں یہاں مزید نہیں رکوں گا۔ میں اسی وقت یہاں سے چلا جاتا مگر اب شام ہو چکی ہے۔ مجھے ہر حال میں اپنی بیوی بچوں کی فکر ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے تعویز کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ویسے تو سرکاری بندوق بھی ہے وہ لوگ ایک ایک کارتوس کا سختی سے حساب لیتے ہیں عوام کے ہجوم کے علاوہ اور کہیں بھی اپنی بندوق استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ دوسری بڑی مصیبت یہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کے لیے کارتوسوں پر سور اور گائے کی چربی لگا رکھی ہے۔ اس لیے میں ان کارتوسوں کو ہاتھ لگانا بھی نہیں چاہتا فقط تعویز ہی ایسا ہے جو باباجی کے کہنے کے مطابق ہمیں آدم خور بدروح سے بچا سکتا ہے۔ ویسے میں نے یہ بتا دیا ہے کہ اگر وہ ظالم چڑیل اور ڈائن مجھے نظر آئی تو میں تمہیں چھوڑوں گا۔ آج اس منحوس مکان میں یہ آخری رات ہے۔ ہم تین روز سے نچلے حصے کا صرف ایک کمرہ استعمال کر رہے ہیں۔ اسی کمرہ میں رات کو ہم سوتے برابر ہی غسل خانہ وغیرہ بھی ہے۔

رات کو بچے تو بیچارے سو گئے لیکن ہم میاں بیوی نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر بچوں پر خود پر دم کر رہے تھے لیکن رات کے فقط دس ہی بجے تھے کہ اوپر سے وہی ڈراؤنی آوازیں شروع ہو گئیں۔ میری بیوی گھبرائی ہوئی تھی اور خود

میں بھی بے حد خوفزدہ تھا اور خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یہ رات خیریت سے گزر جائے تو کل بچوں سمیت اس شیطانی مکان کو چھوڑ دوں گا۔ آوازیں ہر لمحہ تیز تر ہوتی جاری تھیں اور تھوڑی دیر بعد تو کراہوں اور کربناک چیخوں کا نہ ختم ہونے والا طوفان شروع ہو گیا لگتا تھا جیسے جہنم کی ہزاروں بلائیں کسی عذاب میں مبتلا ہوں بری طرح چیخ رہی ہوں میرے بچے گھبرا کر جاگ گئے اور رونے لگے۔ یہ دردناک آوازیں رات کی بے کراں خاموشی اور سناٹے کو چیرتی ہوئی ہمارا خون خشک کیے دے رہی تھیں۔ ایک تیز اور بھیانک چیخ مکان میں گونجی اور مکان کے درودیوار لرزنے لگے۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس کمرے کے ایک ایک چپے سے یہ آوازیں ظاہر ہو رہی ہوں ہمارے دل دہل کر رہ گئے اور ہم دہشت سے کانپنے لگے۔ یکا یک ساری آوازیں یوں ختم ہو گئیں جیسے موجود ہی نہ تھیں۔ ہمارے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ مکان پر اعصاب شکن خاموشی چھا گئی۔ یہ پراسرار خاموشی اور بھیانک سناٹا تو آوازوں سے زیادہ خوفناک ثابت ہو رہا تھا۔ ہمارے اعصاب بری طرح متاثر ہونے لگے۔ اس وقت فضا ساکن ہو گئی تھی اور پوری عمارت پر ہو کا عالم طاری تھا۔ اس ہیبت ناک سناٹے میں خود ہماری اپنی سانسوں کی آواز ایسے محسوس ہو رہی تھی جیسے بہت ہی بدروحیں کھڑی کانپ رہی ہوں۔

اچانک اوپر کی طرف سے ایک لرزہ خیز نسوانی چیخ گونجی اور ہم اچھل پڑے۔ پھر تو اوپر بھگدڑ مچ گئی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ مسلسل چیخوں نے ہمارے اوسان خطا کر دیے تھے۔ بیوی بچے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ خود میرا دہشت کے مارے برا حال تھا ان بھیانک چیخوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی میں نے چیخ کر بیوی بچوں کو تسلی دی اور کہا کہ گھبراؤ نہیں جب تک میں موجود ہوں تم لوگوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی اس وقت خود مجھے حیرت ہوئی جب میرے چیختے ہی ساری آوازیں یک لخت یوں ختم ہو گئیں جیسے مجھ سے ڈر گئی ہوں۔ وہی ہولناک خاموشی چاروں طرف چھا گئی۔ جیسے کائنات اچانک ساکت ہو گئی ہو جہاں تک کہ اگر اس وقت کوئی سکہ بھی نیچے گرتا تو اس کی آواز ہمیں دھماکے سے کم نہ سنائی دیتی۔ اس اعصاب کو جھنجھوڑنے والی خاموشی کو ختم کرنے کے لیے میں نے با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔ جس نے اس وقت ہمارے دلوں کو بڑی تقویت ملی۔ میری بیوی بچے بھی بلند آواز سے کلمہ پڑھنے لگے۔ مگر ابھی ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ دفعتاً ایک ہیبت ناک قہقہہ سنائی دیا جس نے ایک بار پھر ہمیں لرزہ براندام کر دیا۔ قہقہے کی آواز ابھی معدوم بھی نہ ہوئی تھی کہ اچانک ایک دھماکے کی آواز آئی جیسے کسی نے اوپر کے کسی کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر دیا ہو۔ تھوڑی ہی دیر بعد باہر لکڑی کے زینے پر قدموں کی دھمک سنائی دی پھر تو جیسے بھونچال آ گیا۔ لکڑی کا زینہ بری طرح چرچرانے اور قدموں کی دھمک اتنی زوردار تھی جیسے کوئی شہ زور چل رہا ہو صاف ظاہر تھا کہ کوئی زینہ سے نیچے اتر رہا ہے۔ اب میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے بیوی سے تعویذ لے کر گلے میں ڈالا اور ایک کرکلوار اٹھالی۔

ہٹلر

ہٹلر جیسی متنازع شخصیت پر اس کتاب کی تالیف کا مقصد روایتی انداز میں لکھی تاریخ سے ہٹ کر تاریخ میں نئے اور تجزیاتی (Analytical) زاویے روشناس کروانا اور آج کے قاری کو تاریخ کے موضوع کی وسعت کے بارے میں باور کروانا ہے۔ ہٹلر کی زندگی، اسکے فلسفہ، قوم پرستی اور ظلم و بربریت جیسے موضوعات پر ایک مفصل کتاب جسکی تالیف میں کئی ایک دیگر کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔۔۔۔۔ہٹلر کی تاریخ آپ کتاب گھر کے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں جلد ہی پڑھ سکیں گے۔

بیوی نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھ پر خون سوار ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں میرے پاس تعویز ہے وہ بلا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ برآمدے میں شمع دان روشن تھا۔ میں نے باہر آ کر شمع دان اٹھایا اور زینہ کی طرف دیکھا تو وہ ڈائن زینہ کے درمیان میں تھی۔ اس کے آگے کے دو خوفناک سفید دانت منہ سے نکلے ہوئے تھے۔ اس کے کھلے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اس کا سیاہ لباس اس وقت تاریکی کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی خوفناک آنکھیں اندھیرے میں بھی چمک رہی تھیں یہ منظر اتنا ہیبت ناک تھا کہ اگر میرے پاس باباجی کا دیا ہوا تعویذ نہ ہوتا تو شاید میں بھاگ کھڑا ہوتا۔ حالانکہ باباجی مجھے اس بدروح کی خونریزی کی نہایت ہولناک داستان سنا چکے تھے۔ لیکن یہ شاید تعویذ کا ہی اثر تھا کہ سامنے ہوتے ہوئے بھی میں اس سے خوف نہیں کھا رہا تھا بلکہ مجھ میں نہ جانے کہاں سے اتنی ہمت پیدا ہوگئی کہ اسے دیکھتے ہی میں نے اسے للکارا اور پھر آگے بڑھا۔

پتہ نہیں کیوں وہ مجھے دیکھتے ہی چیخ مار کر پلٹی اور اچانک بھاگ کھڑی ہوئی۔ شاید یہ بھی تعویذ کی طاقت تھی جس نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ لیکن اسے یوں بھاگتے دیکھ کر میں بھی بے اختیار زینہ پر چڑھتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ وہ مسلسل چیختی ہوئی اوپر پہنچی اور پہلے کمرے میں داخل ہوگئی اوپر پہنچ کر میں بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرے دائیں ہاتھ میں تلوار تھی اور بائیں ہاتھ میں شمع دان تھا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ خوفناک بدروح میرے سامنے تھی جس نے کئی دنوں سے ہمارا کھانا پینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ چیختی ہوئی پیچھے ہٹی لیکن پیچھے رکھے ہوئے پلنگ سے ٹکرا کر وہ پلنگ کے اوپر گر پڑی۔ تب تک میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا جونہی وہ پلنگ پر گری میں نے خدا کا نام لے کر تلوار سے اس کی گردن پر وار کیا۔ اس کی آخری چیخ بڑی ہولناک تھی ایک ہی وار سے اس کی گردن کٹ کر نیچے جا پڑی۔ اس کا لاشہ پھڑ کنے لگا۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے خون تیزی سے نکل نکل کر پلنگ سے نیچے پھیلنے لگا۔ اس کی گردن کے مختلف حصے پھڑک رہے تھے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نیچے کمرے میں پہنچا تو میری بیوی تھر تھر کانپ رہی تھی اور بچے بھی رو رہے تھے۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر بیوی کی جان میں جان آئی مگر تلوار سے خون کے قطرے ٹپکتے دیکھ کر وہ گھبرا کر بولی۔ کیا ہوا۔ یہ خون کیسا ہے میں نے اسے تسلی دی اور کہا خدا کا شکر ہے۔ بیگم میں نے اس چڑیل کا خاتمہ کر دیا۔ اب ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں اب کوئی ہمیں پریشان نہیں کرے گا۔ اب ہم آرام سے یہاں رہیں گے ویسے اگر تم کہو تو ہم کل ہی یہ مکان چھوڑ دیں گے۔ وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگی پھر بولی۔ پروردگار کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ ہم کل ہی اس منحوس مکان کو چھوڑ دیں گے اور کسی سرائے میں چل کر رہیں گے۔ جب تک کوئی اور مکان نہ مل جائے میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔

میں اب بے حد خوش تھا۔ مگر آہ مجھے کیا پتہ تھا کہ اس بدروح کو ہلاک کر کے میں نے اپنے خاندان کی تباہی کا سامان کر لیا ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اب ہم ہر بلا سے محفوظ ہو گئے ہیں لیکن مجھے یہ علم نہ تھا کہ میری تباہی کا آغاز ہونے والا ہے۔ رات کا باقی حصہ خیریت سے گزر گیا اور کسی قسم کی آواز نہ سنائی دی۔ چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ مگر مجھے علم نہ تھا کہ قضا میری تاک میں ہے۔ اور یہ پراسرار خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

میری بیوی اور بچے آرام سے سوئے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے نیند نہ آئی۔ حالانکہ خطرہ اب ختم ہو گیا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک عجیب سا خوف جاگزیں ہو گیا تھا۔ عجیب عجیب سے خیالات میرے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ جن کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے

برے برے خیالات سے پیچھا چھڑایا اٹھ کر وضو کیا۔ نماز پڑھی اور تلاوت کرنے بیٹھ گیا تو تب جا کر میرے دل کو کچھ سکون نصیب ہوا۔

۱۶جون ۱۸۵۶ء: صبح کو جب ڈیوٹی پر جانے لگا تو میری بیوی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی کہ آج تم مت جاؤ نہ جانے کیوں میرا دل بے حد گھبرا رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اگر تم چلے گئے تو میں تمہیں پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ میں نے اسے سینے سے لپٹا لیا اور کہا بیگم اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ چڑیل تو اب ختم ہو چکی ہے۔ تم فکر مت کرو۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر بھی میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ لو تم یہ تعویذ اپنے پاس رکھ لو۔ میں نے تعویذ اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اور پھر اب شام تک کی تو بات ہے۔ شام کو تو ہم یہ مکان چھوڑ دیں گے۔ لہذا تم کوئی خیال نہ کرو۔ میں شام کو جلدی آ جاؤں گا۔ میں نے اپنی بیوی کو تسلی دی۔ میرے دونوں پیارے بیٹے، نیاز حسین اور مختیار حسین بھی گم سم کھڑے ٹکر ٹکر مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں گلے لگا کر بھینچ بھینچ کر پیار کیا تو وہ بھی مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میں بے حد حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ آج میری بیوی اور بچوں کو کیا ہو گیا ہے۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ شاید رات کے خوفناک واقعے کا ردعمل ہے۔ میں نے بیوی کو تاکید کی کہ سامان وغیرہ باندھ کر رکھنا میں جیسے ہی واپس آؤں گا ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔

جب میں دروازے سے باہر نکلنے لگا تو میری بیوی مجھ سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا اور میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ میں نے اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ کتنے ہی پریشان کن خیالات ذہن میں چکرانے لگے میری بیوی گو کہ مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی لیکن وہ ایک عورت تھی اور آج تک اس نے نہایت ہمت اور حوصلے سے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر آج اس کا رویہ دیکھ میرے دل میں اس کی سلامتی کے خیال سے تشویش ہونے لگی تھی۔

دل نے کہا کہ آج ڈیوٹی پر نہ جاؤں لیکن آج کل ڈیوٹی بڑی سخت ہو گئی تھی بڑے افسروں کو اطلاع ملی تھی کہ مسلمان اور ہندو انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے والے ہیں۔ اس لیے ہمیں ہوشیار رہنے کی تاکید کی گئی تھی یہی وجہ تھی کہ میں ہر حالت میں ڈیوٹی دینے کے لیے مجبور تھا۔ ورنہ میری نوکری خطرے میں پڑ جاتی میں نے پھر اپنی بیوی کو دلاسہ دیا۔ اس کی پیشانی چومی اور شام کو تیار رہنے کو کہا۔ ایک بار پھر اپنے بچوں کو سینے سے لگا کر انہیں پیار کیا اور تینوں کو تسلی دے کر باہر نکل آیا لیکن آج حسب معمول وہ تینوں دروازے پر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے الوداع کہنے لگے۔ میرا دل بھر آیا اور بے اختیار ہو گیا آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے بھی ہاتھ ہلا کر انہیں الوداع کیا نہ جانے کیوں میرا دل ڈوبنے لگا۔ جیسے ہمیشہ کے لیے انہیں الوداع کہہ رہا ہوں۔

میں ڈیوٹی پر تو پہنچ گیا لیکن آج میرا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میرے ساتھی سپاہیوں نے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے۔ آج خاموش ہو۔ مگر میں نے ان سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا دیا۔ میرا دھیان بار بار بیوی بچوں کی طرف جاتا تھا۔ میں ایک ایک لمحہ گن رہا تھا کہ کب وقت ختم ہو اور میں گھر پہنچ جاؤں۔ لیکن آج جیسے وقت ایک جگہ ٹھہر گیا تھا۔ ایک ایک پل صدیوں کی طرح گزر رہا تھا۔ آج ایک عجیب سی بے چینی انوکھا اضطراب تھا۔ کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج یہ بے کلی کیوں ہے۔ جب کہ کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ میں اپنے ہاتھوں سے اس بد روح کو جہنم واصل کر چکا تھا تو پھر یہ بے چینی کس لیے تھی۔ میں نے جب اپنی حالت پر غور کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ یہ رات کے ناخوشگوار واقعے کا اثر ہے اور چونکہ میں رات سو نہیں سکا اس لیے طبیعت پر بوجھ ہے مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اداسی بڑھتی جا رہی تھی

اور دل جیسے ڈوبتا جا رہا تھا میں اس وقت نا قابل اذیت میں مبتلا تھا۔

آخر کار دوپہر کو جب بے قراری حد سے بڑھی تو میں نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے اپنے آفیسر سے جانے کی اجازت مانگی اور جب بڑی مشکل سے اجازت ملی تو میں سیدھا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ میرے بیوی بچے جانے کے لیے تیار بیٹھے ہوں گے اور میں انہیں اسی وقت لے کر کسی سرائے میں چلا جاؤں گا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ میں اڑ کر گھر پہنچ جاتا۔ راستہ تو وہی تھا مگر آج پہلے سے کچھ لمبا لگ رہا تھا۔ بالآخر میں مکان کے قریب جا پہنچا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو خلاف معمول آج پورے مکان پر ویرانی اور گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرا دل کسی انجانے خوف سے دھڑکنے لگا۔ یہ سناٹا مجھے کچھ غیر فطری سا محسوس ہوا۔ میں نے جیسے ہی کمرے کے اندر قدم رکھا۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کمرہ خالی تھا۔ وہاں نہ میری بیوی تھی نہ بچے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید میری بیوی غسل خانے میں بچوں کو نہلا رہی ہو۔ لیکن غسل خانے میں پہنچتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہاں بابا جی کا دیا ہوا تعویذ پڑا تھا۔ مگر بیوی اور بچے غائب تھے۔ تعویذ دیکھتے ہی میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

چند لمحے بعد جب میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے تعویذ اٹھا کر جیب میں رکھا۔ پھر میں بھاگتا ہوا وہاں سے نکلا اور بیوی بچوں کو آوازیں دیتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ مگر پیچھے کے پانچوں کمرے خالی تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں پاگلوں کی طرح بچوں کو پکارنے لگا۔ لیکن جواب میں اپنی ہی آوازوں کی بازگشت ویران دیواروں سے ٹکرا کر واپس آنے لگیں۔ میرے ہوش و حواس رخصت ہونے لگے دل و دماغ میں خوف کے طوفان اٹھنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بیوی بچے کہاں چلے گئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری بیوی خوفزدہ ہو کر بچوں سمیت کہیں چلی گئی ہو۔ مگر کہاں۔ جب کہ یہاں قرب و جوار میں کوئی مکان موجود ہی نہ تھا۔ لیکن یہ بات دل کو نہیں لگ رہی تھی۔ کیونکہ خوفزدہ ہونے کے باوجود اب تک میری بیوی نہایت صبر اور دلیری سے یہاں رہتی تھی اور اب تو خطرہ بھی ٹل چکا تھا کیونکہ میں اس چڑیل کا خاتمہ کر چکا تھا اب تو ڈرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ البتہ ایسا ہو سکتا تھا کہ وہ اوپر پڑی ہوئی چڑیل کی لاش سے ڈر کر کہیں چلی گئی ہو مگر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ وہ جاتی تو کہاں جاتی۔ جب کہ اس پورے شہر میں قریب یا دور کا رشتہ دار نہیں تھا۔ کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ اور پھر غسل خانے میں تعویذ کا موجود ہونا یہ بتا رہا تھا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے لیکن پھر بچے کہاں گئے۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا بے شمار پریشان کن خیالات ذہن میں چکرا رہے تھے۔

لیکن ابھی میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچا تھا کہ دفعتاً مکان کے در و دیوار ایک ہیبت ناک قہقہے سے لرز اٹھے اور میرے ہوش و حواس پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ آواز اسی خونخوار عورت بلکہ چڑیل کی تھی۔ جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے کل رات کو قتل کر چکا تھا۔ یہ آواز سنتے ہی میرا دل دھڑکنا بھول گیا اور حیرت کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور پورے بدن میں دہشت کی سرد لہریں سی دوڑنے لگیں۔ اگر یہ وہی آواز تھی تو وہ چڑیل پھر کیسے زندہ ہو گئی۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ نہیں یہ ناممکن ہے میں نے سوچا۔ میں نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا تھا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یا خدا میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ بیوی بچوں کے صدمے نے کہیں مجھے پاگل تو نہیں کر دیا ہے۔ اسی وقت ایک بار پھر وہ خون سرد کرنے والا قہقہہ گونجا اور میں ایک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔ میں نے دیوار سے ٹنگی ہوئی تلوار اتاری اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ مگر کمرے سے باہر نکل کر میری نظر جب لکڑی کے زینہ پر پڑی تو میں نے ایک ایسا حیرت ناک اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ جس نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا بدن کی ہڈی پر جیسے بچھو سے رینگنے لگے۔ تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی اور میں

پتھر کے بت کی طرح ساکت کھڑا رہ گیا۔ زینہ پر وہی آدم خور عورت کھڑی تھی۔ لیکن اس حالت میں کہ اس کا کٹا ہوا سر اس کے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ جسے اس نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے ابھی تک خون نکل نکل کر اس کے سیاہ کپڑوں کو تر کر رہا تھا یہ بھیانک قہقہے اس کے کٹے ہوئے سر کے حلق سے بلند ہو رہے تھے اور منہ سے نکلے ہوئے دو بڑے دانت اس طرح خون میں سرخ تھے جیسے وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آئی ہو میں بدروحوں اور چڑیلوں کے سینکڑوں قصے سن رکھے تھے لیکن یہ ڈائن تو سب سے زیادہ ہیبت ناک تھی جو مرنے کے بعد بھی زندہ تھی اور کٹے ہوئے سر کے باوجود بھی چل پھر رہی تھی میں اس وقت حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ لیکن مجھے اس سے اتنا ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا اور یہ شاید تویذ کا ہی اثر تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں اگر میرے پاس تعویذ نہ ہوتا تو شاید میں دہشت سے مر جاتا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا کہ کہیں اس بدروح نے تو میرے بیوی بچوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ خیال آتے ہی میری روح تک لرز اٹھی۔

دفعتاً اس کے کٹے ہوئے سر سے ایک غیر انسانی سی آواز بلند ہوئی ہاہاہا دیکھ لیا انجام مجھے قتل کرنے کا ہاہاہا ارے مورکھ تم جسم کو مار سکتے ہو۔ مگر روح کو قتل نہیں کر سکتے۔ دیکھ میں تیرے سامنے اب بھی موجود ہوں۔ ہاہاہا میں نے تجھ سے ایسا بھیانک انتقام لیا ہے کہ تو تو مرنے کے بعد بھی یاد رکھے گا۔ مگر ابھی میرا بدلہ پورا نہیں ہوا ہے۔ دیکھ اپنی بیوی بچوں کا انجام دیکھ، ہا ہاہا اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں سن کر میں چیخ پڑا۔ ظالم چڑیل کہاں ہیں میرے بیوی اور بچے۔ مجھے بتاؤ کہاں ہیں میرے بچے۔ ہاہاہا میں نے انہیں مار دیا۔ سب کو ختم کر دیا۔ میں نے تمہارے بچوں کو خون پی لیا۔ ان کا نرم گوشت بہت مزیدار تھا۔ یہ سنتے ہی میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور سانس جیسے رکنے لگی میری پیاری بیوی اور معصوم بچوں کی شکلیں آنکھوں میں گھومنے لگیں اور بے اختیار آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے دل کو ہاتھوں سے مسل رہا ہو بے گناہ بیوی بچوں کا یہ بھیانک انجام سن کر روح کانپنے لگی اور دل و دماغ جیسے بجلی کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ میرا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اس کی باچھوں سے خون کیوں بہہ رہا تھا۔

مجھے اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی طاقت ہی نہ رہی اور میں بے اختیار زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ غم واندوہ سے میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ صبح کو میں انہیں زندہ سلامت چھوڑ کر گیا۔ میری نظروں کے سامنے صبح کے مناظر گھومنے لگے۔ جب بیوی بچے بار بار لپٹ رہے تھے معاً اس آدم خور بدروح کی آواز پھر میرے کانوں سے ٹکرائی اٹھ اوپر آ کر اپنے بیوی بچوں سے مل۔ اب ان کی روحیں میرے قبضے میں ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ آؤ ان کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ یہ کہہ کر وہ واپس جانے لگی میں تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ مجھے اس ڈائن سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے تو بیوی اور بچوں کے غم نے مجھے جیتے جی مار ڈالا تھا۔ اس کی غیر انسانی آواز پھر گونجی جاؤ۔ آخری کمرے میں تمہاری بیوی موجود ہے۔

میں بھاگتا ہوا چوتھے کمرے میں گیا کہ شاید میری بیوی ابھی زندہ ہو۔ لیکن اندر پہنچتے ہی میں نے ایسا دردناک منظر دیکھا میری روح تک لرز کر رہ گئی۔ میری بیوی کی لاش رسی کے ذریعے چھت سے لٹکی ہوئی تھی رسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی اور ان میں اذیت، خوف، بے بسی کے ایسے بھیانک تاثرات تھے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ میرے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور میں بھاگتا ہوا اپنی پیاری بیوی کی لاش سے لپٹ گیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ میرے دل پر چھریاں سی چل رہی تھیں۔ لیکن میں بے بس تھا۔ وہ مجھ سے بچھڑ کر اتنی دور جا چکی تھی جہاں سے اسے واپس بلانا میرے بس سے باہر تھا۔

نہ جانے میں کتنی دیر تک روتا رہا کہ پیچھے سے ایک بار اس چڑیل کی آواز سنائی دی۔ جاب اپنے بچوں کا بھی انجام دیکھ دوسرے نمبر کے کمرے میں تمہارا چھوٹا بیٹا ہے لیکن خبردار کمرے میں اندر داخل مت ہونا ورنہ تیرا اپنا بیٹا تیرا نرخرا کاٹ دے گا۔ جا کھڑکی سے دیکھ۔ میں بے اختیار آگے بڑھا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مگر کمرے میں نظر پڑتے ہی میں حواس باختہ ہوگیا۔ کمرے میں چھوٹے چیتے کے قد کے برابر ایک سیاہ بلا موجود تھا۔ اس کے علاوہ کمرے میں اور کچھ نہ تھا۔ اس خوفناک بلے کو دیکھ کر میری سٹی گم ہوگئی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میرا بیٹا کہاں ہے۔ اسی وقت اس سرکٹی لاش کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ یہی تمہارا چھوٹا بیٹا ہے۔ جس کی روح کو میں نے اس بلے کے جسم میں قید کر دیا ہے اور یہ روح ہمیشہ قید رہے گی۔

یہ سنتے ہی مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ اپنے پیارے چھوٹے بیٹے کا یہ انجام دیکھ کر میرا دل ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

میرے حواس آہستہ آہستہ میرا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے جاب پہلے کمرے میں اپنے بڑے بیٹے کو دیکھ۔ بدروح کی آواز آئی۔ میں سب کچھ بھول کر پہلے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے کی درز سے اندر جھانک کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کمرہ میں ایک بے حد لمبا سیاہ سانپ زمین سے تین فٹ اوپر اپنا پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ یہ تمہارا بڑا بیٹا ہے جو اب سانپ بن چکا ہے۔ یہ دونوں اب ہمیشہ اس عمارت میں رہیں گے۔ ہاہاہا سرکٹی لاش کی یہ بات سن کر میرے حواس گم ہوگئے۔ مجھ پر اچانک ہذیانی چیخوں کا دورہ پڑا اور میں بے اختیار چیختا ہوا نیچے بھاگا۔ اس وقت مجھے اپنا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اس سرکٹی بدروح بھیانک قہقہے دور دور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔ میں پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا ہوا عمارت سے باہر آ گیا۔ مگر زیادہ دور نہ جا سکا اور راستے میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

۲۷ جون ۱۸۵۶ء: میری آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا مجھے ہوش میں دیکھ کر ڈاکٹر میرے قریب آ گیا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ دو روز پہلے کچھ لوگوں کو میں راستے میں بے ہوش پڑا ملا تھا۔ وہی لوگ مجھے اسپتال لائے تھے۔
ڈاکٹر نے کہا کہ تمہارے دل اور دماغ پر کسی صدمے کا اثر ہے۔ تمہارے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ حادثہ کا ذکر سنتے ہی مجھے اپنی بیوی بچے یاد آ گئے اور میں پھر بے ہوش ہوگیا۔ آخر کبھی ہوش کبھی بے ہوشی کی حالت میں مجھے سات روز گذر گئے تو مجھے نوکری سے بھی جواب دے دیا گیا۔

چنگیز خان

چنگیز کی زندگی اور فتوحات تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے پڑھے بغیر تاریخ کا سفر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کا شمار انسانی تاریخ کے عظیم فاتحین میں سے ہوتا ہے۔ گو اس کا تعلق وحشی قبائل سے تھا لیکن وہ ایک ممتاز درجے کا وحشی تھا۔ وہ صرف تلوار کی زبان ہی نہ جانتا تھا بلکہ از روئے ضرورت ٹریک ٹو ڈپلومیسی بھی بروئے کار لاتا۔ 1219 سے 1225 تک کے درمیانی عرصے میں چنگیز نے ترکستان کے راستے ایران اور افغانستان، دوسری طرف پامیر کی پہاڑی چوٹیوں سے سندھ کے کناروں تک آذربائیجان، کاکس اور جنوبی روس کے علاقے کی مہمات سر کیں...... چنگیز خان کی تاریخ آپ کتاب گھر کے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں جلد ہی پڑھ سکیں گے۔

کل میری حالت سنبھلی تو آج مجھے رخصت کیا گیا ہے ڈاکٹر تو کچھ روز اور ہسپتال میں رہنے پر زور دے رہا تھا۔ مگر مجھے دہشت ہو رہی تھی۔ لہذا میں چلا آیا۔ اب میرا نہ کوئی گھر ہے نہ سہارا ہے۔ اب تو مجھے کسی نوکری کی پرواہ ہے۔ نہ ہی اپنی زندگی کی فکر ہے۔ جب میرے پیارے ہی نہ رہے تو پھر بھلا میں جی کر کیا کروں گا اور پھر اب مزید زندہ رہوں بھی تو کس کے لیے۔

اجولائی ۱۸۵۶ء: اب چونکہ میرا کوئی گھر نہیں ہے نہ ہی نوکری ہے اس لیے تین چار روز سے میں ایک باغ میں سوتا ہوں۔ ویسے بھی مجھے آدھی تنخواہ دے کر ہی نوکری سے جواب دیا گیا تھا۔ اس لیے مجھے کھانے پینے کی بھی فکر نہیں ہے یوں بھی میری بھوک پیاس اب اڑ چکی ہے۔ میرے کپڑے میلے ہو گئے ہیں میری حالت بھی اب خراب رہنے لگی ہے۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے ہیں۔ میری دنیا لٹ چکی ہے۔ میرا سب کچھ اس پراسرار مکان میں رہ گیا ہے۔ میری زندگی میری پیاری بیوی اور بچے۔ سبھی کچھ تو وہیں ہے۔

میں نے بہت چاہا لیکن اپنے بیوی بچوں سے الگ میں نہ رہ سکا۔ ویسے بھی اب نہ مجھے اس سرکٹی بدروح کی پرواہ ہے۔ نہ ہی بلے اور سانپ کا ڈر ہے اور پھر ان سے ڈرنا کیا۔ وہ تو میرے پیارے اور معصوم بچے ہیں۔ بھلا ان سے کیا ڈرنا۔ اگر ان کے ہاتھوں مجھے موت آ جائے تو اچھا ہے۔ یوں بھی اپنے بیوی اور بچوں کے بغیر میں جینا بھی نہیں چاہتا۔ یہی سب سوچ کر میں پھر اسی خوفناک عمارت میں آ گیا ہوں۔ میں نے بہت چاہا کہ اس ہیبت ناک عمارت میں نہ جاؤں۔ لیکن کیا کروں اپنی بیوی بچوں سے جدا نہیں رہ سکتا حالانکہ مجھے اس بدروح نے دھمکی بھی دی تھی کہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ مگر اب مجھے کسی بات کا خوف نہیں ہے۔ میں تو خود موت کی آرزو کر رہا ہوں تاکہ اپنے پیاروں سے جلد مل سکوں۔

اب رات ہو چکی ہے۔ میں اس کمرے میں آ کر بیٹھا ہوں جسے میں بیٹھک کے طور پر استعمال کرتا تھا یہیں میں کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میرے سامنے ایک میز رکھی ہے یہیں بیٹھ کر میں اپنی ڈائری لکھ رہا ہوں۔ میں دوپہر کو یہاں آیا تھا اس وقت سے نہ تو وہ بھیانک سرکٹی عورت دکھائی دی ہے نہ ہی میں نے اپنے بچوں کو دیکھا ہے۔ کوئی آواز بھی اب تک نہیں سنائی دی ہے۔ اس وقت رات آدھی ہو چکی ہے اور میں بیٹھا ہوا ڈائری لکھ رہا ہوں۔

میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ چند روز تک میرا گھر بھی آباد تھا۔ مگر اب تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میری دنیا اندھیر ہو چکی ہے۔ اس وقت مکان پر ہولناک ویرانی چھائی ہوئی ہے چاروں طرف پراسرار خاموشی اور ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ایسے میں جھینگروں کی آواز اس خواب ناک فضا میں نہایت عجیب لگ رہی ہے۔ ابھی ابھی مکان کے اندر سے اسی سرکٹی خونخوار عورت کے قہقہے کی آواز آئی ہے۔ مگر میں ڈائری لکھنے میں مصروف ہوں۔

وہ قہقہوں کی بھیانک آوازیں میرے کمرے کے قریب آتی جا رہی ہیں۔ لیکن مجھے پرواہ نہیں ہے۔ میں لکھتا جا رہا ہوں۔ اب مجھے قدموں کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔ اب وہ آوازیں اس کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی ہیں اچانک دروازہ بھیانک چرچراہٹ کی آواز سے کھلا ہے اور وہ بدروح اپنا کٹا ہوا سر ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کا رخ میری طرف ہے۔ ابھی تک خون اس کی گردن سے بہہ رہا ہے۔ میں نے چند لمحوں کے لیے اس پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے کٹے ہوئے سر کی آنکھیں ادھر ادھر حرکت کر رہی ہیں اور منہ سے خون کے قطرے بھی ٹپک رہے ہیں۔

اب اس نے اپنا سر نیچے پھینک دیا ہے۔ اب وہ پھر میری طرف بڑھ رہی ہے۔ شمع کی روشنی میں وہ بغیر سر کے نہایت

خوفناک نظر آ رہی ہے۔ حالانکہ وہ دیکھ نہیں سکتی کیونکہ اس کا سر تو زمین پر پڑا ہے مگر پھر بھی وہ میری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے حیرت کی بات ہے۔ اس کا سر نیچے گرا ہوا ہے لیکن پھر بھی سر سے شیطانی قہقہے بلند ہو رہے ہیں۔
اب وہ شیطانی روح میرے قریب پہنچ چکی ہے۔ لیکن میں لکھتا جا رہا ہوں۔ اس بدروح کے جسم سے ناقابل برداشت سڑاند اٹھ رہی ہے۔ اب وہ اپنے دونوں ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھا رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میری گردن پر جم گئے ہیں۔ اب وہ دبا رہی ہے۔ میرا دم اب..........."

یہاں پر پہنچ کر ڈائری کے اس صفحے پر ایک ٹیڑھی لکیر نیچے تک چلی گئی تھی۔ اس کے اور ڈائری کے باقی صفحات خالی تھے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد کانسٹیبل غلام اکبر مر گیا۔ یعنی ڈائری لکھتے ہوئے بدروح نے اس کا گلا گھونٹ دیا۔"
یہاں پہنچ کر رشید رک گیا۔ ہم حیرت سے منہ پھاڑے رشید کی حیرت ناک آپ بیتی سن رہے تھے۔

☆☆☆

رشتوں کے ریشم

رفعت سراج کے بہترین اور خوبصورت افسانوں کا مجموعہ......رشتوں کے ریشم......جس کی سطر سطر محبت خلوص یگانگت، اور بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں سب رشتے خوبصورت ہیں، ہر رشتہ ریشم سے زیادہ خوبصورت اور مظبوط ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے **افسانے** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔
۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔



رشید کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر اس نے اپنی آپ بیتی دوبارہ شروع کر دی۔

"ڈائری پڑھنے کے بعد میں نے کرسی پر جو ڈھانچہ کپڑوں سمیت دیکھا تھا۔ وہ کانسٹیبل غلام اکبر کا ڈھانچہ تھا۔ کیونکہ اس کے سامنے میز پر ہی وہ ڈائری رکھی جو میں نے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ہلکے پاور کے بلب کی کمزور روشنی میں وہ ڈائری پڑھ رہا تھا۔ ڈائری ختم ہوئی تو میں اس خوفناک عورت کے تصور میں گم ہو گیا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ خونخوار بلا اور سانپ کون تھے اور وہ رسی کے ذریعہ چھت سے لٹکنے والی لاش کس کی تھی۔ پھر مجھے وہ مسکراتی بھیانک لاش یاد آ گئی۔ جس نے خود مجھے بھی ایک کمرے میں گھیر لیا تھا اور میں نے بڑی مشکل سے اس کمرے سے بھاگ کر اپنی جان بچائی تھی۔

ڈائری پڑھنے کے بعد مجھے وہ سارے حیرت ناک واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ جنہیں میں بڑی مشکل سے اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اب ایک بار پھر مجھے وہ اذیت ناک لمحات پوری شدت سے یاد آ گئے تھے۔ اس وقت میں خود کو تصور میں پھر اس بھیانک عمارت میں موجود پا رہا تھا۔ میرے دل و دماغ جو پہلے ہی کمزور ہو چکے تھے۔ اب پھر متاثر ہوتے جا رہے تھے۔ میں مکمل طور پر ان عبرت ناک مناظر میں کھو چکا تھا۔ میں اپنے قرب و جوار کے ماحول سے اس قدر بے خبر ہو گیا تھا کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس وقت میں اپنے گھر اور اپنے کمرے میں موجود ہوں۔

ایسے عالم میں جب مجھے وہ آدم خور کھیاں یاد آئیں لٹکی ہوئی لاش سے چمٹی ہوئی تھیں اور جب اس لٹکی ہوئی لاش کی کھلی ہوئی آنکھیں میرے تصور میں آئیں تو میری چیخ نکل گئی اور میں کانپنے لگا۔ اسی وقت مجھے اس کی وہ بھیانک مسکراہٹ بھی یاد آ گئی جو سیڑھیوں پر مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بکھری تھی۔ لیکن پھر مجھے وہ خون آشام خون یاد آیا جس نے سانپ کی طرح میرا پیچھا کیا تھا تو میرے حواس جواب دے گئے۔

اس وقت امی جان میری چیخ سن کر میرے کمرے میں آ گئیں ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور جسم پر میلا سا سیاہ لباس تھا۔ انہیں دیکھ کر میرا دماغ ایک دم الٹ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ خوفناک بدروح میرے آگے کھڑی ہے۔ میرے اوسان مکمل طور پر خطا ہو گئے میں نے اپنی ماں کو بدروح سمجھا اور اچانک چیختے ہوئے ان پر حملہ کر دیا۔ میری حالت دیکھ کر امی خوفزدہ ہو گئیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور میرے اچانک حملہ پر وہ بھی بری طرح چیخنے لگیں۔ ان کی چیخیں سن کر میری حالت اور خراب ہو گئی اور میں مکمل طور پر پاگل ہو گیا۔

اس دن کے بعد جو عورت بھی میرے سامنے آئی میں اسے بدروح سمجھ کر اس پر حملہ کر دیتا۔ آخر کار پہلے پولیس نے پکڑا اور تشدد کر کے میرا دماغ اور خراب کر دیا اور خطرناک پاگل سمجھ کر مجھے یہاں لایا گیا۔ تب سے میں یہاں ہوں اور اللہ کا کرم ہے کہ اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

اپنی آپ بیتی ختم کر کے رشید دیر تک لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت اعتدال پر آ گئی۔ آخر میں رشید بولا۔

"سلیم صاحب یہ کہانی بالکل سچی ہے اور اس کا ثبوت وہ ڈائری ہے جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔"

☆☆☆☆☆

ختم شد

☆☆☆☆☆